انور اعظمی کی اردو شاعری، ایک تجزیاتی اور تنقیدی مطالعہ

(Anwar A'zmi's Urdu Poetry, An Analytical & Critical Study)

Thesis submitted for the Degree of Philosophy in Urdu
(Dept. of Arabic, Persian, Urdu & Islamic Studies, Bhasha-Bhavana, V.B)



Submitted by:

Mohd. Sajid

Under Supervision

Prof. Niaz Ahmad Khan

Visva Bharati Logo

Department of Arabic, Persian, Urdu & Islamic Studies,
Bhasha-Bhavana, Visva-Bharati
Santiniketan, West Bengal
2016

مقالہ برائے پی ایچ ڈی

انور اعظمی کی اردو شاعری، ایک تجزیاتی اور تنقیدی مطالعہ

(Anwar A‘źmi’s Urdu Poetry, An Analytical & Critical Study)

مقالہ نگار

محمد ساجد

زیر نگرانی

پروفیسر نیاز احمد خان

شعبۂ عربی،فارسی،اردو اور دراسات اسلامیہ

بھاشا بھون، وشوابھارتی، مغربی بنگال

2016

فہرست

باب اول

اعظم گڑھ کی مختصر تاریخ

فصل اول: اعظم گڑھ کی مختصر تاریخ

فصل دوم: اعظم گڑھ کی علمی تاریخ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اعظم گڑھ کی مختصر تاریخ

ہندوستان کی تاریخ خطہ اعظم گڑھ کے تذکرہ کے بغیر نامکمل اور ادھوری رہے گی۔ یہ ضلع یو پی کی لہلہاتی فصلوں، سبزہ زار باغوں، بل کھاتی دور تک ندی نالوں کے درمیان شمال مشرق میں واقع ہے۔ راجہ اعظم خاں نے ۱۶۶۵ء میں اس جگہ کا نام اپنے نام کی نسبت سے اعظم گڑھ رکھا اور بسایا۔

علوم وفنون کی مختلف شاخون میں یہاں کے مکینوں نے بلند مقام حاصل کیا ہے۔ ہر شعبہ حیات میں اسے سبقت حاصل ہے۔ مذہبیات ہو یا ادبیات، نثر ہو یا شاعری، فکشن ہو یا تنقید، تاریخ ہو یا فلسفہ اعظم گڑھ نے عظمتوں کی روشن عمارتیں تعمیر کی ہیں اقبال سہیل نے یہاں کے ہر ذرہ کو نیر اعظم کہا تھا غلط نہیں کہا تھا یہاں کے ہر ذرہ میں ایک آفتاب پنہاں ہے

بڑے بڑے نامور علماء، ادباء، مورخین، اور اولیاء اللہ اس زرخیز دھرتی کی مٹی سے پروان چڑھے اور انہوں نے علم وفن، تحقیق وتصنیف کے مختلف میدانوں میں وہ گراں قدر خدمات انجام دیں جنہیں تاریخ میں سنہری حرفوں سے لکھا جاتا ہے اور جن کے گراں قدر کارناموں کو اہل علم نے ہمیشہ تسلیم کیا ہے۔ علم وفن شعر وادب کی دنیا میں جن کی غیر معمولی خدمات اور کارناموں کو بین الاقوامی اور قومی سطح پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان میں سے چند نہایت معروف اور معتبر نام بطور نمونہ یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔ مولانا فاروق خان چریاکوٹی، علامہ شبلی نعمانی، مولانا حمیدالدین فراہی، مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارک پوری، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا اسلم جیراج پوری، مولانا ابوالیث اصلاحی ندوی، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا جلیل احسن ندوی، مولانا احمد محمود اصلاحی، انور اعظمی، اقبال سہیل، کیفی اعظمی، شمس الرحمٰن فاروقی، مہا پنڈت راہل سانسکرتائن، شیام نرائن پانڈے، اجودھیا سنگھ اپادھیائے ہری اودھ، کملا کانت وغیرہ

اعظم گڑھ کی وجہ تسمیہ

اعظم گڑھ دو لفظ ''اعظم'' اور ''گڑھ'' سے مرکب ہے۔ لفظ ''اعظم'' سے اس شہر کے بانی راجہ اعظم خان کی طرف اشارہ ہے۔ ''گڑھ'' ہندی لفظ ہے جس کے معنی قلعہ کے آتے ہیں۔ ہندوستان میں پائے جانے والے کئی شہر ایسے ہیں جن کے نام کے ساتھ لفظ ''گڑھ'' جڑا ہوا ہے دراصل ان کی آبادی کا آغاز کسی فوجی آبادی سے ہوا یعنی کسی بادشاہ یا رئیس نے اپنی اور اپنے متعلقین کی حفاظت کی غرض سے کوئی ''گڑھ'' بنوایا اور اسے اپنے نام کی طرف منسوب کر دیا۔ اس سلسلے میں مولانا سید سلیمان ندوی رقم طراز ہیں۔

> **''ہندوستان کے اکثر وہ شہر جن کے نام کا آخری جزء ''گڑھ'' ہے ان کی آبادی کا آغاز درحقیقت کسی فوجی آبادی سے ہوا۔ یعنی کسی رئیس یا زمین دار نے اپنے یا اپنی رعایا کے لیے کوئی ''گڑھ'' بنوایا اور اس کو اپنے نام کی طرف منسوب کر دیا اعظم گڑھ بھی اسی قسم کا شہر ہے''۔** [۱]

بانی اعظم گڑھ

شہر اعظم گڑھ کی تاریخ آج سے تقریباً چار صدی قبل سے شروع ہوتی ہے۔ جب بادشاہ جلال الدین اکبر کے زمانے میں کالپی کی جنگ کے بعد گوتم راج پوت خاندان کے راجہ شہد یو سنگھ کے چھوٹے بھائی چندسین ضلع فتح پور اپنے وطن سے منتقل ہو کر موضع کھجوری مینہ نگر میں آبسے تھے۔ ان کے دو بیٹے ابھیمن سنگھ اور ساگر سنگھ تھے۔ ایک بار ابھیمن سنگھ کسی ضرورت سے آگرہ گئے جہاں دین اسلام کی عالم گیر عظمت اور رواداری سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گئے۔ بادشاہ جہاں گیر نے ان کی عزت افزائی کی اور ''دولت خان'' کے خطاب سے سرفراز کیا۔ اور چوبیس پرگنوں کی جاگیر عطا کی۔ جاگیر کے یہ چوبیس پرگنے زیادہ تر موجودہ اعظم گڑھ میں واقع ہے۔

راجہ دولت خان کے کوئی اولاد نہیں تھی لیکن ان کے بھائی ساگر کے پانچ بیٹے تھے۔ ہربنس، دیل، گوپال، جے نرائن اور جنک۔ ان کی وفات کی صحیح تاریخ نہیں ملتی تاہم ان کی قبر مینہ نگر میں ہے۔

انہوں نے اپنی جائداد بڑے بھتیجے ہر بنس کو وصیت کر دی تھی ۔ ہر بنس کے دو بیٹے تھے۔گمبھیر اور دھرندھر۔ ہر بنس کے بعد گمبھیر کو راجہ کی گدی ملی ۔لیکن اس کے کوئی اولاد نہ تھی ۔گمبھیر کے بعد دھرندھر اس کی جگہ پر ہوا۔ان کے تین بیٹے تھے۔وکر ماجیت ،نرائن اور رودر۔گدی وکر ماجیت کو ملی ۔انہوں نے رودر کو مار دیا اور اس کی تمام جائداد پر قبضہ کر لیا۔رودر کی بیوی بھوانی دیوی نے افسران سے اس کی شکایت کی ۔نتیجہ یہ ہوا کہ وکر ماجیت سنگھ شاہی فوجوں کے ہاتھوں مارا گیا اور اس کی جائداد اس کی بیوہ بیوی بھوانی رانی کو دی گئی ۔وکر ماجیت نے اسلام قبول کر لیا تھا۔اور ایک مسلم بیوی سے اس کے دو بیٹے پیدا ہوئے تھے ایک کا نام اعظم خان اور دوسرے کا عظمت خان تھا۔

اعظم خان اور عظمت خان

اعظم خان نے ۱۶۶۵ء میں اعظم گڑھ کی بناء رکھی ۔ یہ راجہ بڑا بہادر اور دانش مند تھا۔ملک کی ترقی اور رعایا کی آسائش و آرام کا خاص خیال رکھتا تھا۔ہندوستان کے لئے سولہویں صدی کا اختتام اور سترہویں صدی کا آغاز بہت ہی پر آشوب گزرا ہے۔بالخصوص اعظم گڑھ اور اس کے اطراف و جوانب میں طوائف الملو کی پھیلی ہوئی تھی ۔بادشاہ اعظم خان نے اپنی طاقت کا اندازہ کر کے اپنے دشمن بس بین پنتھ اور بیس راج پوتوں سے اپنے بھتیجے باد بہادر سنگھ کے خون کا بدلہ لینے کے لئے اپنی فوج شمال کی طرف بڑھایا۔اور سرجو پار ہو جانے پر بڑھیا پار کے راجہ کو خبر دی ۔چنانچہ دونوں فوجیں اکٹھا ہوئیں ۔اعظم خان کی فوج نے دشمن کو شکست دے کر میدان سے بھگا دیا۔کمانڈر کے حکم سے مینہ نگر کی فوج نے بھاگنے والوں کا تعاقب کیا اور اعظم خان نے پہاڑ سنگھ کے بھائی مڑواپار کے راجہ کو راپتی ندی کے کنارے موت کے گھاٹ اتار کر اپنی تلوار کی پیاس بجھائی ۔

وفات راجہ اعظم خان

''بیان کیا جاتا ہے کہ جس وقت مہا راجہ شیوجی دکن میں اپنی حکومت کرنے میں مصروف تھا اسی وقت شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر نے اعظم خان کو دکن کی مہم سر کرنے کے لئے بھیجا۔اعظم خان نے اپنے خیال کے مطابق کام کیا جس سے مغلوں کے

دلوں میں کچھ شبہات پیدا ہو گئے اور شیوا جی کے خیر خواہ ہونے کا جرم لگا کر دکن سے واپسی کے وقت قنوج کے قلعہ میں راجہ مذکور کو تمام عمر کے لئے قید کر دیا گیا۔ آخر کار موت نے راجہ کو دائمی سزا سے بچا لیا راجہ کی لاش قنوج سے اعظم گڑھ لائی گئی اور ٹونس ندی کے کنارے موضع باغ لکھراؤں میں دفن کی گئی۔ چنانچہ اسی وجہ سے وہ گھاٹ راج گھاٹ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ راجہ لاولد پیدا ہوا‘‘۔ ۲؎

محل وقوع:

موجودہ اعظم گڈھ مشرقی یوپی کا ایک مردم خیز حصہ ہے۔ اسکے اتر میں گھا گھرا ندی، گورکھ پور اور دیوریا ضلع واقع ہے۔ اور دکھن میں اس کی سرحدیں جونپور اور غازی پور سے ملتی ہیں۔ اور پچھّم میں فیض آباد اور سلطان پور ضلع پڑتے ہیں اور پورب میں اس کی سرحدیں غازی پور اور بلیا ضلع سے ملتی ہیں یہ ضلع پورب سے پچھّم تقریباً ۷۲ میل لمبا اور اتر سے دکھن لگ بھگ ۵۶ میل چوڑا ہے۔ اس کا کل رقبہ دو ہزار ایک سو چالیس [۲۱۴۰] مربع میل ہے۔ پہلے اس کا اتری حصہ چکلہ اعظم گڈھ مع پرگنہ ماہل، مئوناتھ بھنجن و مبارک پور ضلع گورکھ پور میں شامل تھا۔ یہ علاقہ ۱۰ نومبر ۱۸۰۱ء گورنر جنرل لارڈ ولزی اور اودھ کے نواب سعادت علی خان کے درمیان ایک معاہدے کے تحت انگریزوں کو ملا تھا۔ اور ایسٹ انڈیا کمپنی میں شامل کر لیا گیا تھا‘‘۔ ۳؎

اس کے بارے میں مولانا شرر لکھنوی لکھتے ہیں۔

’’نواب سعادت علی خان نے ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۸ء میں تخت پر بیٹھتے ہی آدھا ملک انگریزوں کے حوالے کر دیا تھا۔ مشہور ہے کہ وہ سلطنت سے مایوس و ناامید بنارس میں پڑے ہوئے تھے کہ خبر پہونچی۔ نواب آصف الدولہ بہادر نے سفر آخرت اختیار کی اور مسند حکومت پر وزیر علی خان بیٹھ گئے۔ یہ سنتے ہی سلطنت کی رہی سہی امیدیں بھی خاک میں مل گئیں۔ وہ قطعی یاس کے عالم میں تھے کی بنارس کے کسی یورپین حاکم نے

پوچھا: نواب صاحب! اگر آپ کو اودھ کی حکومت مل جائے تو انگریزی حکومت کو کیا دیجئے گا۔ جو چیز ہاتھ سے جا چکی ہو انسان کے دل میں اس کی قدر کیا ہو سکتی ہے؟ بے اختیار زبان سے نکلا آدھا ملک انگریزوں کی نذر کر دونگا۔ وعدہ سن کر انگریز حاکم نے کہا تو آپ خوش ہوں اور میں آپ کو خوش خبری سناتا ہوں کہ آپ ہی فرمارواۓ لکھنو منتخب ہوئے ہیں سعادت علی خان یہ مژدۂ غیر مترقبہ سن کر خوش تو ضرور ہوئے۔ مگر اپنے وعدے کا خیال آیا تو سناٹے میں آ گئے۔ اور تخت نشینی کے بعد اس وعدے کے ایفاء میں انہیں اپنی آدھی قلم رو بانٹ دینی پڑی جس کا کانٹا زندگی بھر ان کے دل میں کھٹکتا رہا''۔

۴

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ''انگریزی تاریخوں میں ان سے وعدے لیے جانے کا ذکر نہیں ہے۔ مگر اس کو سب تسلیم کرتے ہیں کہ نواب سعادت علی خان کو چوں کہ انگریزوں نے تخت پر بٹھایا تھا اس لئے انہوں نے اپنا آدھا ملک انگریزوں کی نذر کر دیا''۔ ۵

جب گھا گھرا ندی اپنی جگہ سے اتر کی جانب بڑھ گئی تو یکم اکتوبر ۱۹۰۴ء کو اعظم گڈھ ضلع میں مزید ایک سودو (۱۰۲) گاؤں کا اضافہ ہو گیا جن کا مجموعی رقبہ ۷۶ مربع میل ہے۔ پورا ضلع اعظم گڑھ ایک ہموار میدانی علاقہ ہے قدرتی اعتبار سے اسے تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے (۱) گھا گھرا کا کچھار (۲) ٹونس ندی کا بیسن (۳) اور دکھنی حصہ

آب وہوا:

ضلع اعظم گڈھ ہر لحاظ سے صوبہ اتر پردیش کے بہترین اور زرخیز ضلعوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کے کئی قدرتی حصے ہیں ان تمام میں حد درجہ کی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ عام طور پر اس ضلع کی آب وہوا گرم اور خشک ہے۔ موسم سرما میں خوب سردی رہتی ہے برسات کے موسم میں خوب اچھی بارش ہوتی ہے جب کہ گرمیوں میں خوب لو چلتی ہے اس طرح یہاں کے باشندے تینوں موسموں سے لطف اندوز ہونے

کے ساتھ ساتھ ان کے اثرات سے اچھی طرح سے واقف ہوتے ہیں اور کسی بھی آب وہوا میں زندگی گزارنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اس لئے یہاں کے باشندے محنتی، بہادر، اور جفاکش ہوتے ہیں اور ہر گرم سرد حالات میں اپنی زندگی آسانی سے گزار سکتے ہیں۔ جس طرح یہ ضلع اپنی بناوٹ اور آب وہوا میں یکساں واقع ہوا ہے اسی طرح اس کی پیداوار معمولی فرق کے ساتھ ایک ہی طرح کی ہوتی ہے۔ اس ضلع کی خاص پیداوار دھان، گیہوں، چنا، مٹر، جوار، باجرہ، خربوزہ، تربوزہ، گنا، شکرقند ہیں۔

اعظم گڈھ میں اسلام کی کرن:

سرزمین اعظم گڈھ پر طلوع اسلام کی کوئی حتمی تاریخ نہیں ملتی ہے۔ البتہ تاریخ کے حوالے سے یہ بات درجہ وثوق تک پہونچتی ہے کہ ''سلطان محمود غزنوی'' کی مسلسل فتوحات کے عہد میں یہ علاقہ اسلام اور مسلمانوں سے کسی قدر واقف ہو گیا تھا۔

اس سلسلے میں حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی اپنی شہرہ آفاق تصنیف ''تذکرہ علماء اعظم گڑھ'' میں لکھتے ہیں:

> **''اس سرزمین پر آفتاب اسلام کی ضیاء پاشی کب سے ہوئی اور دین وایمان کا نور کس زمانہ میں پھیلا اس کی حتمی تعیین تو مشکل ہے۔ البتہ تاریخ کی روشنی میں وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ''سلطان محمود غزنوی'' کی مسلسل فتوحات کے عہد میں یہ علاقہ اسلام اور مسلمانوں سے کسی قدر آشنا ہو گیا تھا۔ اس کے بعد سرخیل مجاہداں ''سالار مسعود غازی علوی'' (ولادت ۴۰۵ھ۔ شہادت ۴۲۴ھ) اور ان کے رفقاء کی مجاہدانہ سرگرمیوں کے ذریعہ اس خطہ ارض میں اسلام اور مسلمانوں کا شہرہ ہوا۔ حضرت سالار مسعود غازی نے دہلی، غازی آباد وغیرہ مقامات پر فتح ونصرت کا پرچم نصب کرنے کے بعد موضع ''ستھرکھ'' بارہ بنکی کو مرکز بنا کر قنوج، کڑا مانک پور، بنارس وغیرہ میں کلمہ توحید کا آوازہ بلند کیا اور ۴۲۰ھ کے حدود میں اطراف وجوانب کی ہر بڑی آبادی میں مہمات روانہ کیں''۔ [۶]**

اعظم گڈھ گزیٹیر میں ہے کہ سالار مسعود غازی کی فوجیں بہرائچ ہوتے ہوئے بھگت پور (ضلع اعظم گڈھ) میں چند دن قیام کیا تھا۔ یہ مقام مبارک پور کے شمال مغرب میں آٹھ (۸) میل کی مسافت پر واقع ہے۔ اور یہاں ہر سال غازی میاں کا میلہ لگتا ہے۔ ان علاقوں میں متعدد مزارات پائے جاتے ہیں۔ جن کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ سالار مسعود غازی کے رفقاء اور احرار کے مزارات ہیں۔

شیخ عبدالرحمٰن دھنیٹی چشتی ''مرأۃ الاسرار'' میں رقم طراز ہیں:

''وبعد ازاں ملک افضل را با اقرباءِ او بطرف بنارس ونواحی آں رخصت نمود آستانہ او با دیگر شہدا آنجا شہرت دارد، وبعد ازاں ملک عمر، وملک طغرل را با جماعت ایشاں بطرف پرگنات بیسواڑہ تعین کرد، دراں نواحی تردد نمایاں کردہ بشرف شہادت فائض گشتہ۔ چنانچہ مقابر ملک عمر شہید وطغرل شہید وغیرہ در قصبہ بحلوارہ نواغ آں زیارت گاہ خلق است وملک عمر شہید مذکور بغایت مردانہ خفتہ است وتصرفے۔ راحت دار دو ہمیں در ہر شہرے ودر ہر قصبہ ملک و بہر دیہیئے مردم اہل اصلاح و صاحب شجاعت کارواں جابجا نصب نمود۔ چنانچہ دریں ملک بر جاہ اسیدہ ام، اثرے از اصحابہ الشہد اء یافتہ ام وہمہ جا زیارت گاہ خلق است ؎

ترجمہ:

''سالار مسعود غازی ملک افضل کو ان کے رفقاء کے ساتھ بنارس اور اس کے نواح میں بھیجا۔ جن کا روضہ دوسرے شہداء کے ساتھ ان کے اطراف میں مشہور ہے، اس کے بعد ملک عمر اور ملک طغرل کو ان کے رفقاء کے ساتھ بیسوارہ کے پرگنوں میں متعین کیا۔ یہ حضرات ان علاقوں میں سرگرمی دکھا کر شہید ہو گئے۔ چنانچہ ملک عمر و ملک طغرل وغیرہ کی قبریں مقام بحلورا اور اطراف میں زیارت گاہ ہیں ملک طغرل نہایت بہادرانہ نشان سے آسودہ خواب ہیں اور ان کے اثرات ظاہر ہیں۔ اور اسی سید سالار مسعود غازی نے ہر شہر، ہر قصبہ اور ہر دیہات میں ملک حضرات میں سے مصلحون اور

بہادروں کو جابجا متعین کیا۔ چنانچہ ان علاقوں میں جہاں بھی گیا ہوں ان بزرگوں کے آثار دیکھے ہیں اور ہر جگہ ان کی زیارت گاہیں موجود ہیں‘‘

اور آئینہ اودھ میں شاہ ابوالحسن قطبی مانک پوری وضاحت کرتے ہیں کہ:

’’کسی تاریخ میں سوائے لڑائی کڑا مانک پور اور کوئی لڑائی سید مسعود کی درج نہیں ہے۔ لیکن اکثر قبر میں گنج شہیداں دیہات وقصبات متعلقہ اضلاع رائے بریلی، سلطانپور فیض آباد، پرتاپ گڑھ، اعظم گڈھ، جون پور، بنارس اور غازی پور میں برابر پائی جاتی ہیں۔ اور جہاں جہاں قبریں ہیں باوجود اس قدر تمادی ایام کے عام طور پر بلا کسی اختلاف کے یہ کہا جاتا ہے کہ یہاں معرکہء مجاہدانہ غازی میاں ہوا ہے اور یہ انہیں کے ساتھی کی قبریں ہیں (لہٰذا) ناظرین کتاب کو خیال رہے کہ ممالک مغربی و شمالی اودھ میں جہاں مقابر شہیداں ہمراہیاں غازی میاں کہا جائے اسے باور کرنے میں تأمل نہ کیا جائے‘‘ ۸؎

سالار مسعود غازی اور ان کے مجاہدین رفقاء ’’بنارس‘‘ کے راستے ہوتے ہوئے دیوگاؤں، لال گنج، محمد پور، اور نظام آباد ہوتے ہوئے شہر اعظم گڑھ میں اسلام کی روشنی کے ساتھ پہونچا۔ سالار غازی دین اسلام کی تبلیغ کے لئے اپنے مصاحبوں کو اعظم گڑھ کے مختلف سمتوں میں روانہ کردیا۔ ایک جماعت شاہ گڑھ کی طرف روانہ ہوگئی۔ وہاں پہونچ کر اس اطراف واکناف کے مواضعات میں جیسے: فخرالدین پور، گجڑا، مبارکپور وغیرہ میں بود وباش اختیار کرلی اور وہاں کے باشندوں کو اسلام کی حقانیت سے روشناش کرایا اور دوسری جماعت اعظم گڈھ سے شمال کی جانب جیگہاں، بلریا گنج، بھگت پور وغیرہ علاقوں میں گئی اور لوگوں کو اللہ کی ذات اور اس کی وحدانیت سے باخبر کیا۔ ان مقامات پر ان مجاہدوں کے مقبرے اور شہیدوں کی قبریں موجود ہیں۔ اس حوالے سے مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں۔

’’یہی حضرات سالار مسعو غازی علویؒ کے رفقاء ہیں جنہوں نے علاقہ اعظم گڑھ سب سے پہلے عقیدہ توحید کی تخم ریزی کی اور اسی زمانہ سے یہاں خال خال مسلم نو آبادیاں

وجود میں آئیں۔ان اللہ کے مخلص بندوں کی اس ابتدائی مہم کے بعد ایک طویل مدت تک اس علاقہ میں کوئی اسلامی مہم برپا نہیں ہوئی اور ایک عرصہ دراز تک بالکل خاموشی رہی،اسی وجہ سے ان غازیوں اور شہیدوں کے نام وکام کی تفصیلات بلکہ ان کی قبروں کا صحیح حال ملنا مشکل ہوگیا۔اوران پراسرار بندوں کے سوانح بھی خود انہیں کی طرح پر اسرار ہے۔[۹]

اعظم گڑھ کے بعض مردم خیز علاقے

سرائے میر:

یہ قصبہ مدرسۃ الاصلاح کے اتر جانب واقع ہے۔یہاں حضرت میر علی عاشقان علیہ الرحمہ بہت مشہور صوفی عالم گزرے ہیں،انہی کی طرف نسبت سے اسے سرائے میر کا نام دیا گیا ان کا مزار اب بھی یہاں موجود ہے ان کے علاوہ اور بہت سے اہل علم وقلم اس کی شہرت کا ذریعہ ہیں۔

نظام آباد:

یہ سرائے میر سے دس میل پورب کی جانب واقع ہے۔یہاں بہت سے علماء،ولی اللہ پیدا ہوئے۔کہا جاتا ہے کہ دیوان عبدالرشید صاحب رشید یہ کا اصل وطن یہی تھا۔حضرت میر علی عاشقانؒ کے پیر حضرت شاہ عبدالقدوس شاہ قدّن یہیں مدفون ہیں۔سرائے میر سے متصل پھریہا نام کا ایک گاؤں ہے۔یہی گاؤں مولانا حمید الدین فراہیؒ کا مولد ومسکن ہے اور علامہ شبلی نعمانیؒ کا ننیہال بھی ہے۔

چریا کوٹ:

اعظم گڈھ کا ایک قدیم اور مشہور قصبہ چریا کوٹ ہے۔زمانہ قدیم سے یہ راجپوتوں اور شیوخ کی آبادی رہی ہے۔یہاں نامور علماء،ادباء اور صلحاء پیدا ہوئے۔مولانا قاضی علی اکبرؒ اور انکے صاحبزادے عنایت رسولؒ اور مولانا فاروقؒ اسی کے چشم وچراغ تھے۔

مبارک پور:

اسی طرح ایک نام قصبہ مبارک پور کا ہے۔ جو زمانہ قدیم سے پارچہ بافی کا مرکز رہا ہے۔ جہاں پچھلے زمانہ میں چند نامور علماء پیدا ہوئے یہاں ایک عظیم الشان مسجد اور دو عربی مدرسے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اور یہاں کے نامور علماء میں سے سید عبدالباری، مولانا عبدالستار، مولانا شمس الدین اور قاضی اطہر مبارک پوری ہیں۔

ماہل:

نویں صدی ہجری میں سلطان ابراہیم شرقی نے شیخ محمد عیسی جونپوری کو از راہ نوازش پرگنہ ماہل اور اسکے کئی گاؤں جاگیر میں عطا کئے ۔ یہ علاقہ بہت ذرخیز اور مردم خیز رہا ہے۔ یہاں بڑے بڑے اہل طریقت و شریعت گزرے ہیں۔ شیخ بہاؤالدین اور ان کے صاحبزادے یہاں کے مشہور عالموں میں سے ہیں۔ شیخ گلشن علی بن شیخ عطا ماہلی متوفی ۱۲۰۰ھ اور فارسی کے مشہور شاعر اور تبحر عالم مولوی حسن علی بن نوازش علی ماہلی متوفی ۱۲۵۸ھ اسی سرزمین کے مشہور نام ہیں یہیں سے پروفیسر احتشام حسین جیسے نقاد اور شاہد ماہلی جیسے شاعر کا تعلق ہے۔

اعظم گڑھ کی علمی تاریخ

اعظم گڈھ کی علمی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنا اس کا وجود۔اس کی علمی وادبی تاریخ کا باقاعدہ سلسلہ سالار مسعود اوران کے رفقاء کار کے زمانہ سے ہی شروع ہوجاتا ہے ان کے افراد واصحاب وفود اور جماعت کی شکل میں مختلف علاقوں کی طرف نکل کر علم وفضل کا چرچا عام کیا،اس کے بعد ۵۹۰ھ میں سلطان شہاب الدین غوری نے قنوج کے علاقے کو فتح کرتے ہوئے بنارس،گوالیار اوراس کے اطراف واکناف کے علاقوں کواسلامی قلم رو میں شامل کر لیا اس طرح وہ پورا علاقہ جس کو برطانوی دور میں صوبہ متحدہ (اودھ) کہا جاتا تھا اسلامی سلطنت میں داخل ہوگیا جس کا ایک حصہ موجودہ اعظم گڑھ بھی تھا۔اسی دور سے اس علاقے میں مسلمانوں کا فی الجملہ عمل دخل شروع ہوااور وہ اپنے دینی وعلمی امتیازات کے ساتھ ابھرا،اس کے بعد ہر زمانہ میں چاہے غلاموں کا دور رہا ہو یا خلجیوں کا،حکمرانوں کا زمانہ رہا ہو یا مغل سلاطین اور برٹش گورمنٹ کا خطہ اعظم گڑھ اپنی علمی وادبی اور دینی آب وتاب کے ساتھ دنیا کے افق پر جگمگا تا رہا۔ اس بارے میں بطور حوالہ مولانا حبیب الرحمٰن کی کتاب سے ایک پیراگراف نقل کر دینا کافی ہوگا۔

''خطہ اعظم گڈھ کی اس اجمالی سرگذشت سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ حضرت سید مسعود سالار غازی کے رفقاء اوران کے بعد شیخ اسدالدین وشیخ صدرالدین نے اس علاقہ میں علم وایمان کا چراغ روشن کیا تھا۔بعد میں سلاطین شرقیہ نے ان چراغوں کے لئے فانوس فراہم کرنے پر ہی اکتفانہیں کیا، بلکہ علم وعرفان اور حکمت ودانائی کے اس قدر مزید چراغ جلائے کہ اس خطہ کا قریہ قریہ،گاؤں گاؤں ان ضیا پاشیوں اور نور افشانیوں سے جگمگا اٹھا،ان کے بعد لودی حکمرانوں بالخصوص سلطان سکندر لودی نے اس سلسلہ میں قابل قدر کارنامے انجام دیئے ان کے اختتام کے بعد بساط حکومت پر مغل سلاطین جلوہ گر ہوئے ان کے دوصد سالہ دور میں بھی اس سرزمین کی علمی آب وتاب اسی شان کے ساتھ باقی رہی ،تا آنکہ حکومت مغلیہ کے دور زوال ۱۱۳۰ھ میں شام اودھ سے

ظلمت کی بادصرصر چلنی شروع ہوگئی جس کی زد میں آکر یہاں کے بعض چراغ خانے گل ہو گئے۔لیکن اس تیز سیاہ آندھی کے باوجود علم ودانش کے اکثر چراغ اپنی روشنی بکھیرتے رہے اوراس دیار کی علم وحکمت اور نور وسرور کی محفلیں آراستہ رہیں اور آج بھی جب کہ شرقی علوم کی کساد بازی انتہا کو پہونچ گئی ہے اور علماء کے قدیم خاندان کسم پرسی کی بدولت تباہ وشکستہ حال ہیں، لیکن اس سرزمین کی مردم خیزی باقی ہے۔ ع

''ہوا کے رخ پہ ہے اپنی شمع جلائے ہوئے''

جس کا واضح اور معتبر ثبوت یہ ہم دست کتاب'' تذکرہ علماء اعظم گڑھ'' ہے اس کا مطالعہ کرنے والے ورق ورق سے محسوس کریں گے کہ واقعی یہ علم ودانش اور شعور وآگہی کی سرزمین ہے یہاں سے مفسر، محدث ،فقیہ،مورخ،فلسفی،ادیب، مصنف، اصحاب درس، ارباب طریقت اور قوم وملت کے رہنما اور پاسباں پیدا ہوتے ہیں سرزمین اعظم گڑھ کی یہی اصل تاریخ ہے اور اپنی اس قابل ستائش تاریخ کو یہاں کا ذی شعور طبقہ زندہ وتابندہ رکھے ہوئے ہے۔صحیح معنوں میں اعظم گڑھ کی یہی شناخت ہے۔یہی اس کا واقعی چہرہ ہے۔وہ نہیں جس کو بعض ظلم پیشہ، جہالت کے پاسباں اور تاریک فکرو نظر کے حامل بتانے کی بیجا تگ ودو میں مصروف ہیں'' ۔[۱۰]

اعظم گڈھ کی علمی وادبی تاریخ کو بآسانی سمجھنے کے لیے چار ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا مشرقی سلطنت کا عہد دوسرا لودیوں کا زمانہ تیسرا دور مغلیہ اور چوتھا نوابین اودھ کا زمانہ۔

اب اسے قدر تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے۔

اعظم گڈھ کی علمی ترقی کا دور ۸۰۴ھ سے شروع ہوکر ۸۸۱ھ پر ختم ہوتا ہے۔اس دور کی فصاحت کرتے ہوئے سید سلیمان ندوی رقم طراز ہیں۔

''یہ عہد حکومت نہ صرف یورپ بلکہ پورے ہندوستان میں علم وفن کی بہار کا زمانہ تھا قنوج سے لے کر پٹنہ تک گاوں گاوں میں شرفاء کی آبادیاں قائم ہورہی تھیں قصبوں میں

قاضیوں مفتیوں اور شیوخ وقت کو جاگیریں اور معافیاں دی جارہی تھیں۔اور ہر جگہ علم و فن اور فضل وکمال کی مسندیں بچھی ہوئی تھیں اور طلبا کے قافلے اس سرے سے اس سرے تک علم کی طلب اور تحصیل میں آجارہے تھے۔آج بھی ان اطراف میں شرفاء کے جو خاندان آباد ہیں ان کے بزرگ اسی عہد کی یادگار ہیں اور جن کے ہاتھ جو کچھ ہے وہ انہیں شرقی بادشاہوں کا فیض ہے۔علماء اور اہل ہنر دور دراز علاقوں سے کھنچے چلے آتے تھے۔۱۱

اس عہد کے بڑے بڑے علماء اور شیوخ دور دراز علاقوں سے سفر کر کے جون پور ہوتے ہوئے اعظم گڑھ آئے اور اس کے اطراف میں بود باش اختیار کی مثلا سلطان محمد بن تغلق ۷۵۲ھ کے دور حکومت میں شیخ مخدوم ظہیر الدین صدیقی اعظم گڑھ کی قدیم آبادی محمد آباد گہنہ میں آکر آباد ہوئے یہاں انہوں نے علم وہدایت کا چراغ روشن کیا رشد و ہدایت کا یہ سلسلہ نسلا بعد نسل چلتا رہا۔ پھر فیروز شاہ تغلق بانی جونپور کے زمانہ میں ایک اور بزرگ محمد آباد گہنہ میں آئے جن کے خاندان میں کئی اہل علم پیدا ہوئے۔ اس خاندان نے بعد میں چل کر بڑی علمی ، دینی ،ادبی وثقافتی حیثیت حاصل کی ۔اور اس خاندان کے اسلاف کی ساری علمی وادبی روایات کو بعد والوں نے بھی باقی رکھا۔

ابراہیم شاہ شرقی کے زمانے میں شیخ جمال الدین ہانسوی متوفی ۶۵۵ھ کے فرزند شیخ بہاؤالدین سندھالہ سے آکر محمد آباد اقامت پذیر ہوئے ۔جن کی اولاد میں شیخ ابراہیم دانش مند جیسے متبحر عالم اور صاحب فضل وکمال بزرگ ہوئے''۔۱۲

شیخ محمد خضر متوفی ۸۱۱ھ اسی عہد مسعود میں دہلی سے جونپور آئے اور ایک میدان میں درخت کے نیچے بیٹھ گئے ۔ جب سلطان ابراہیم شاہ شرقی کو اس کی اطلاع ہوئی تو بہت کمال عقیدت ومحبت سے انہیں اپنے پاس لے آیا اور ان کے لئے رہائش کا انتظام کیا اور انہیں پورے اعزاز واکرام سے رکھا کہ ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے شیخ مشید کو پرگنہ محمد آباد گہنہ میں ولید پور وغیرہ کئی گاوں جاگیر میں دیئے۔ بعد میں شیخ مشید کا خاندان جون پور سے منتقل ہو کر قصبہ ولید پور اعظم گڑھ میں آ گیا۔

اس خاندان میں بڑے پائے کے صاحب علم و فضل اور بڑے فضل و کمال کے علماء گزرے ہیں شاہ ابوسعید، شاہ ابوالخیر، شاہ اسمعیل، ملا محمود، شاہ ابوالغوث اور شاہ ابواسحاق وغیرہ اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔

سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے زمانے میں شیخ شاہ فتح اللہ اودھی انصاری بھی دہلی سے جونپور آئے تھے اس بارے میں انہیں کے خاندان کے ایک عالم، مصنف اور شاعر مولوی علی حسن ماہلی متوفی ۱۲۵۸ھ اپنی خودنوشت میں تحریر کیا ہے۔

''راقم کے اجداد میں سے ایک بزرگ شاہ فتح اللہ انصاری سلطان تغلق کے دور میں دہلی آئے کچھ دنوں وہاں رہنے کے بعد سیر و سیاحت کرتے ہوے جون پور پہنچے جو ان دنوں سلاطین شرقیہ کا دار السلطنت تھا یہاں ان کے ارشاد و تلقین کا شہرہ عام ہوا۔ اور حاکم وقت ان کی زیارت کا مشتاق ہوا۔ ایک دن جامع مسجد میں ان سے ملا اور مہینہ میں دو بار ان کی مجلس وعظ میں حاضر ہوتا رہا کچھ دنوں کے بعد سلطان نے شاہ فتح اللہ کی اولاد کے گزر بسر کے لئے چند مواضعات پرگنہ ماہل میں جو جون پور کے پرگنات و مضافات میں ہے بطور جاگیر عطا کئے انہوں نے پرگنہ مذکور میں اپنے بڑے صاحب زادے شاہ بہاؤالدین کے نام سے بہاؤالدین پورا اور کندھار (کندھراپور) دو گاؤں آباد کئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کی ان کا مزار بھی اسی قریہ میں ہے۔[۱۳]

اعظم گڈھ کی علمی تاریخ بلکہ ہندوستان کی علمی وادبی تاریخ ادھوری اور نامکمل رہے گی اگر اس میں علماء چریاکوٹ اور ان کے علمی وادبی کارناموں کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ اعظم گڈھ کے نامور ادیب اور شاعر اقبال احمد خاں سہیل اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''چریاکوٹ ضلع اعظم گڈھ کے مشرقی حصہ میں ایک چھوٹا سا قریہ ہے مگر سچ پوچھئے تو سرکار جونپور شمالی سے اس کو وہی نسبت ہے جو دماغ کو جسم انسانی کے دوسرے اعضاء سے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر سرکار جونپور کو علم و دانش کا نظر فریب چمنستان قرار دیا جائے تو

اس کا سب سے نزہت آفریں سرمایہ ناز چمن یہی خطہ قرار پائے گا۔ ہندوستان کا کون سا گوشہ ہے جو فضل وکمال کے اس سرچشمہ سے سیراب نہیں ہوا۔ حضرت مولانا احمد علی ،حضرت مولانا علی عباس ،فخر الادباء والمھندسین حضرت مولانا عنایت رسول اوراستاذ المتأخرین مولانا فاروق جیسے ائمہ فن جس خاک سے اٹھے ہوں اس کا مجد وشرف کسی دلیل کا محتاج نہیں'' [۱۴]۔

اصل حقیقت یہ ہے اس علمی خانوادے میں ہمیشہ ایسے علماء وفقہاء پیدا ہوتے رہے جنہوں نے اپنے دور کی علمی وثقافتی زندگی پر نہایت گہرے اثرات مرتب کئے ہیں اس خاندان نے تقریباً چھ صدی تک نسلاً بعد نسل علم وادب ،حکمت وفلسفہ اور دوسرے علوم وفنون کے میدان میں خدمات گرانمایہ انجام دی ہیں۔

ضلع اعظم گڈھ میں علم وادب اور تہذیب وتمدن کا دوسرا دور ۸۸۱ھ سے شروع ہوکر ۹۳۲ھ پر ختم ہوتا ہے۔اس عہد کے ایک مشہور عالم وبزرگ شیخ قطب الدین ''بینا دل'' سرہرپوری الجونپوری ہیں۔ جن کے فیوض وبرکات اور علم وعرفان کی کرنیں جونپور، غازی پور، اعظم گڈھ اور فیض آباد کے علاقوں میں پھیلیں۔ان کے کئی خلفاء ومریدین تھے جن میں شیخ نصیرالدین قلندرظفرآبادی متوفی ۱۹۱۵ء کا نام کئی اعتبار سے بہت اہم ہے۔انہوں نے اپنے مرشد کی نظر میں اتنا خصوص وامتیاز حاصل کرلیا تھا کی شیخ بینا دل نے اپنی صاحبزادی کوان کے رشتہ ازدواج میں دے دیا تھا۔اسی زمانے میں مولانا عبداللہ جونپوری بھی تھے۔یہ اپنے علاقے کے زبردست عالم وفاضل اور علوم حکمت ومعرفت میں خاص مرتبہ کو پہنچے ہوئے تھے ان کی پیدائش جونپور میں ہوئی۔ بڑے ذہین اور طباع تھے بچپن ہی سے علم وادب کا خوب ذوق تھا۔ان کے علم وفضل سے اعظم گڈھ کے قریات ومضافات کو بڑا فائدہ پہونچا۔

ان کے علاوہ شیخ حافظ شطاری ،شاہ عبد القدوس شطاری نظام آبادی اس عہد کے زبردست عالموں میں شمار ہوتے ہیں۔شاہ عبدالقدوس شطاری کا دوسرا نام ''شاہ قدن'' بھی تذکرہ کی کتابوں میں ملتا ہے اورایک تحقیق کے مطابق یہ ضلع اعظم گڈھ کے سب سے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اردوزبان میں

شاعری کی جواس وقت آب وگل کے مرحلے سے گزر رہی تھی۔

اسی عہد کا ایک مشہور نام میر علی عاشقان سرائے میری کا ہے۔ یہ اپنے علم وعرفان، زہد وعبادت جذب وکیف اور کشف وکرامت کے لحاظ سے اسی خطہ ہی کے نہیں بلکہ اسی عہد کے اولیاء کبار میں سے تھے۔ان کی خانقاہ مرجع خلائق تھی اسی قدسی صفت بزرگ کی بدولت قصبہ سرائے میر رشد وہدایت کے ایک عظیم مرکز کی حیثیت سے نمایاں ہوا۔اور تقریباً ڈیڑھ سو سال تک اس کی مرکزیت قائم رہی۔ان کی وفات کے بعد ان کے صاحب زادے میر سید نظر علی نے باپ کی وراثت کی نگہبانی کی اور اس گنج گرامایہ کو اپنے اخلاف کے سپرد کر کے جہان دگر کی راہ لی۔ بارہویں صدی کے دوسرے دہے تک خاندان عاشقیہ کا یہ رشد وہدایت کا چراغ جلتا رہا۔ میر علی عاشقان کی کئی اولادیں تھیں سب نے خلق خدا کی رہنمائی کے لئے شمع ہدایت روشن کی تھیں۔اس عہد میں علوم وفنون کے مختلف میدانوں میں علماء وفضلاء کی جماعت نے جو کار ہائے نمایاں انجام دیے ہیں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر حبیب اللہ لکھتے ہیں۔

''اسی دور میں علم وعرفان درس وارشاد کی بزم آراستہ کرنے والے علماء صوفیاء کے حالات وتراجم دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں سے بہت سے اتنے جلیل القدر تھے جن کی ذات میں علم وعرفان اور تہذیب وثقافت کی تاریخی خصوصیات جمع ہو گئی تھیں اور اپنے سیر وسیاحت والے مزاج یا امراء وسلاطین کی دعوت کی وجہ سے ایک جگہ پڑے نہیں رہے بلکہ یہ ہمیشہ دریا کی طرح رواں دواں رہے کبھی یہاں کے خطے میں خیمہ علم نصب کر رہے ہیں تو دوسرا قدم دہلی یا لاہور کی سرحد پر پڑ رہا ہے علم وتہذیب کے فاصلے سمیٹ رہے ہیں اور اس دور میں خطہ جاتی تہذیب وتمدن اپنی تمام تر حد بندیوں سے آزاد ہوتے ہوئے نظر آرہے ہیں اعظم گڈھ کے علماء ومشائخ جو مختلف خطہ ارض، طبقہ فکر اور مختلف خانوادۂ علم سے تعلق رکھتے تھے اسی دور میں اپنے افکار ونظریات کے نئے آمیزے سے ہندوستان کو لذت آشناں کر رہے تھے اس دور میں علم کی شاخیں پھیل گئی تھیں کتابوں کے موضوعات میں تنوع پیدا ہو گیا تھا تحقیق وتدقیق

اور درس وتدریس کے میدان وسیع ہو گئے تھے،تصنیف وتالیف کا دائرہ جزئیات کو بھی اپنے اندر شامل کرنے لگا تھا تصوف وسلوک اور طریقت ومشیخت کے نئے نئے سلسلے وجود میں آئے مختلف افکار ونظریات کے دبستان کھل گئے عقائد وخیالات کے نئے زاوے سامنے آئے اور سوچنے سمجھنے کے انداز بدلے۔علماء کی ذات مجمع الحیثیات ہوئی متعدد علوم میں تبحر ومہارت کے بغیر شخصیت نا تمام سمجھی جانے لگی۔اس لیے علماء بیک وقت کئی علوم وفنون کے جامع ہوا کرتے تھے۔پھر بھی اساتذہ اپنے اپنے گھر پر اسی علم و فن کی تعلیم دیتے تھے جس میں انہیں مرتبہ امتیاز اور وجہ اختصاص حاصل ہوا کرتا تھا جس فن کے اصرار وغوامض سے پوری طرح واقف نہ ہوا کرتے تھے اس کی تعلیم وتدریس کی ہوس عام نہیں ہوا کرتی تھی اس لیے ایک مقام پر اور ایک ہی زمانے میں کئی کئی مدرسین اپنے اپنے مخصوص فن کی الگ الگ تعلیم دیا کرتے تھے اور طلبہ کو اپنے مخصوص فن کا ماہر بنا کر سند فراغت دیا کرتے تھے‘‘۔۱۵؎

اعظم گڈھ علم وفن کی ترقی کا تیسرا دور اس دیار میں تیموری سلطنت کے قیام سے شروع ہوتا ہے، جو (۹۳۲ھ سے ۱۱۳۰ھ) بابر سے شروع ہو کر فرخ سیر کے عہد پر ختم ہوتا ہے۔یہ دوسوسالہ دور اپنی علم و ادب اور تہذیب وثقافت کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔اور اسی تیسرے دور میں گذشتہ دونوں دور کی علمی ودینی اور ادبی وتہذیبی سرگرمیوں،تحریکوں اور ترقیوں کے اثرات وثمرات نکھر کر سامنے آئے۔اس دیار کے قریات و قصبات علم وعلماء کی برکتوں سے مدرسہ علم ودانش بن گئے۔بابر کے دور میں برونہ ضلع اعظم گڈھ میں شیخ احمد بن زین جونپوری برونوی متوفی ۹۶۳ھ تھے۔یہ ایک متبحر عالم،متوکل،متقی بزرگ تھے۔اکثر علماء وفضلاء نے ان سے تحصیل فراغت کی ہے۔یہ زہد وتقوی میں زندگی بسر کرتے تھی اور شریعت کے پابند تھے۔رسالہ ’’نافع‘‘ ان کی تصنیف ہے۔تمام عمر کسی کے گھر کھانا نہیں کھایا اور نہ کسی کا نیاز قبول کیا۔

ضلع اعظم گڑھ کی علمی وادبی ترقی کا چوتھا دور نوابین اودھ کے قیام ۱۱۳۲ھ سے شروع ہوتا ہے اور ۱۲۷۳ھ تک رہتا ہے۔یہ دور کل ایک سو اکتالیس سال (۱۴۱) کا ہے اس عہد کے چند ایسے اہل علم وفن کے تذکرے کئے جا رہے ہیں جن کے بغیر اس عہد کی علمی تاریخ نامکمل رہے گی۔

شیخ غلام رشید جونپوری برونوی متوفی ۱۱۶۷ھ دیوان محمد رشید جونپوری برونوی کی اولاد میں ممتاز صاحب علم وفضل اور اہل طریقت وسلوک عالم فاضل بزرگ گزرے ہیں، فرائض ونوافل کے بڑے پابند تھے کہا جاتا ہے کہ پوری زندگی میں کبھی بھی فرائض ونوافل فوت نہیں ہوئے ۔مولانا محمد احسن عباسی چریا کوٹی ہندوستان کے مشہور اور بڑے نامور عالموں میں سے ہیں ان کی ذات نابغہء زمانہ اور عجوبہء روزگار تھی ،علوم عقلیہ ونقلیہ میں کافی دسترس حاصل تھی ،حافظہ بڑا زبردست تھا، جو کتاب ایک بار دیکھ لیتے وہ پوری کی پوری یاد ہوجاتی تھی ان کے فضل وکمال کا آوازہ شہرت جب حاکم شہر کو ہوا تو بلا کر عزت افزائی کرنی چاہی مگر حاسدوں نے انہیں زہر دے دیا۔

نوابی دور میں ایک بڑا مشہور علمی گھرانہ وجود میں آیا یہ ضلع اعظم گڑھ میں عالموں، فاضلوں، وکیلوں ،فلسفیوں سائنسدانوں ،دانشوروں ،ادیبوں اور شاعروں کا گھرانہ سمجھا جاتا تھا اس خاندان میں ایسے مردان کار اور رجال العصر پیدا ہوئے جنہوں نے پورے برصغیر کو اپنے علمی وادبی افکار ونظریات سے متأثر کیا جس کے ذکر کے بغیر ضلع اعظم گڈھ کی علمی وادبی تاریخ نامکمل رہے گی ۔

> **''مولانا احمد علی چریا کوٹی ۱۲۰۰ھ سے ۱۲۷۲ھ تک اپنے دور میں ہندوستان کے علماء کبار میں شمار کیئے جاتے تھے،آپ کے درس سے بیشمار رائمہ علم وفن نے استفادہ کیا ہے اور رجال عصر بن کر اٹھے جملہ علوم وفنون میں خداداد مہارت حاصل تھی تفہیم مطالب میں ایسا ملکہ حاصل تھا کہ پیچید سے پیچیدہ علمی مسئلے کو باتوں باتوں میں سمجھا دیتے تھے اور غبی سے غبی طالب علم بھی نفس مسئلہ سے آگاہ ہوجاتا تھا''** [۱۶]
>
> **''مختلف علوم میں تقریبا سو کتابیں تصنیف کیں،مولانا کو عملی سائنس سے بھی دلچسپی تھی، انہوں نے ۱۲۵۱ھ میں ایک ایسا چرخہ ایجاد کیا تھا جو بھاپ کے ذریعہ خود بخود حرکت کرتا تھا۔آپ اکثر کہا کرتے تھے کہ اگر دولت حاصل رہی تو میں ایک ایسا آلہ ایجاد کرتا جس پر پانچ آدمی سوار ہوکر ایک دن میں سو فرسخ کا سفر طے کر سکتے تھے''** [۱۷]

مولانا عنایت رسولؒ اور مولانا فاروق چریا کوٹیؒ کے والد گرامی قاضی علی اکبر عباسی

(۱۲۲۰ھ/ ۱۲۸۳ھ) بلا کے ذہین تھے۔ فلسفہ وعلم کلام میں مہارت رکھتے تھے تعلیم کا فطری ذوق پایا جاتا تھا مقدمات ومسائل کی تحقیق میں اپنی جداگانہ رائے رکھتے تھے مناظر بھی تھے اور کبھی مناظرے میں شکست نہیں کھاتے تھے مولانا نے محمد شکور مچھلی شہری سے ''جوہر فرد'' کے بارے میں مناظرہ ہوا موصوف نے آپ کی جوہر شناشی کی داددی'' ۱۸

''پورہ معروف کے مولانا محمد طاہر (۱۲۲۵ھ/ ۱۲۹۶ھ) مولانا کرامت علی جونپوری (۱۲۱۵ھ/ ۱۲۹۰ھ) کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ آپ کی شخصیت بڑی پہلو دار اور ہمہ جہت تھی متعدد علوم وفنون میں مہارت رکھتے تھے۔ حافظ قرآن خوش الحان بہترین خطاط، اچھے پہلوان اور فن سپہ گری سے واقف ہونے کے ساتھ حکیم بھی تھے۔ حصول تعلیم کے بعد گھر پر ساری زندگی توجہ الی اللہ اور علمی تدریسی، دینی اور اسلامی خدمت میں صرف کردی۔ پورہ معروف کی قیادت وسیادت آپ کی ذات میں محصور تھی۔ ہر جمعہ کو جامع مسجد میں وعظ کہنے کا التزام کر رکھا تھا۔ آپ کا ذاتی کتب خانہ بھی تھا جس میں آپ کی لکھی ہوئی کتابیں مثلاً قرآن مجید کے چند مختلف سائز کے نسخے، بخاری، مسلم، موطا امام مالک، الجامع الصغیر، مسند امام اعظم، مشکوۃ، مجالس الابرار، حصن حصین مواھب الحکم وغیرہ آج بھی موجود ہیں۔ آرٹ اور نقاشی کے عمدہ نمونے بھی ہیں آپ کا معمول تھا کہ روزانہ ایک پارہ کلام پاک خوشخط لکھتے تھے۔ نائب قاضی بھی تھے اور مقدمات اور تنازعات کا فیصلہ نیز عصری مسائل کا تصفیہ بھی آپ ہی کرتے تھے'' ۱۹

''علماء چریاکوٹ کا اعظم گڑھ کی علمی وثقافتی ترقی میں بڑا اہم رول رہا ہے۔ جن میں مولانا قاضی علی اکبر عباسی اور ان کے صاحبزادے مولانا عنایت رسول چریاکوٹی کو اولیت حاصل ہے۔ غازی پور میں سرسید نے ان بزرگون سے علمی استفادہ کیا''۔ ۲۰

انگریزی دور اقتدار میں بڑے بڑے علماء وادباء عصر پیدا ہوے جنہوں نے اردو زبان وادب کی

خدمت گراں مایہ انجام دیں۔ ان میں اکثر کا تعلق اسی دیار علم وفن سے تھا۔ مثلا: مولانا فاروق کے شاگردوں میں مولانا شبلی نعمانی، مولانا جواد بہاری، مولانا سید سلیمان ندوی، اکبرالہ آبادی، مولانا عبد الباری فرنگی محلی، مولانا جمال الدین افغانی، جسٹس محمود، جسٹس سر شاہ محمد سلیمان، جسٹس سر سید عبدالرؤف، مولانا عظمت اللہ فرنگی محلی، محمد شاہ سلیمان پھلواری، عبدالوہاب بہاری منطقی، مولانا عثمان فلسفی، مولانا حسن کانپوری، اقبال سہیل، مولانا نیاز فتح پوری، حکیم نابینا اور ڈاکٹر مختار انصاری کے نام ملتے ہیں۔ ان میں سے سب کے سب اپنی علمیت وشخصیت کے اعتبار سے اپنے اپنے دور میں ایک ادارہ کی حیثیت رکھتے تھے۔

بیسویں اور اکیسویں صدی کی چند معروف شخصیات

عہد تیموریہ میں بسنے والا یہ وہ شہر ہے جس کے چھوٹے چھوٹے قصبات نے ایسے ایسے آفتاب و مہتاب کو جنم دیا جن کی ضوفشانی پوری علمی کائنات میں ہے مبدءِ فیاض کے الطاف وعنایات کی مظہر یہ وہ سرزمین جس کی عظمتوں کے نقوش پوری علمی کائنات میں مرتسم ہیں۔ یہاں کے چھوٹے چھوٹے قصبات سے آفاقی اور عالمگیر شہرت کی حامل شخصیات نے جنم لیا اور نظام افکار واقدار پر اپنے گہرے اثرات مرتب کئے۔

علامہ شبلی نعمانی

مورخ اسلام شمس العلماء مولانا شبلی کی پیدائش ۱۸۵۷ء غدر کے ہنگامہ خیز زمانہ موضع بندول میں ہوئی۔ والدین نے محمد شبلی نام رکھا، ابتدائی تحریروں میں مولانا اپنا نام محمد شبلی لکھتے تھے، بعد میں صرف شبلی کر دیا اور نام کے ساتھ نعمانی لکھنے لگے۔ قرآن مجید اور فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر حکیم عبداللہ جیراج پوری اور شکر اللہ صبرحدی سے حاصل کی۔ اس کے بعد مدرسہ اسلامیہ اعظم گڑھ میں مولانا فیض اللہ اور مولانا علی عباس سے عربی کی کچھ کتابیں پڑھیں پھر باقاعدہ مولانا فاروق چریاکوٹی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور درسیات کی تکمیل کی۔ جملہ علوم وفنون تحصیل کے بعد بھی آپ کے علمی ذوق کو سیری نہ ہوئی تو

پھر آپ دوسرے خرمنوں سے بھی خوشہ چینی کے تیار ہو گئے۔اس زمانہ میں مدارس بہت کم تھے۔زیادہ تر مشاہیر اپنی اپنی جگہوں پر مسند درس و افادہ کو زینت دے رہے تھے۔یہی آستانے اس وقت کی یونیورسٹیاں اور جامعات تھے۔

چنانچہ علامہ شبلی نعمانی نے مزید حصول علم کے لیئے لکھنو کا رخت سفر باندھا۔وہاں پہونچ کر مولانا ارشاد حسین کے حلقہ درس کو منتخب کیا اور انہیں کے شرف تلمذ پر اکتفاء کیا اور فقہ واصول فقہ کی تعلیم حاصل کی یہاں سے فراغت کے بعد مزید طلب علم کی تشنگی باقی رہی تو لاہور کا رخ کیا وہاں مولانا فیض الحسن سہارنپوری پروفیسر اورینٹل کالج لاہور کے چشمہ فیض سے سیراب ہوئے اور استاد محترم سے ادب عربی کا صحیح ذوق پیدا کیا ان تمام علوم سے فراغت کے بعد اس عہد کی روایت کے مطابق علم حدیث کی تحصیل کی طرف متوجہ ہوئے اور اس دور کے نامور محدث احمد علی سہارنپوری کی خدمت میں حاضر ہوئے اوران سے حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ ہر طریقے سے علمی ذوق کی پیاس بجھانے کے بعد درس وافادہ کے لیئے ۱۸۸۳ء میں علی گڑھ کالج میں عربی کے اسسٹینٹ پروفیسر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔تقریبا سولہ سال تک علی گڑھ کالج میں تدریسی خدمات انجام دیں۔اسی زمانہ میں انہوں نے قسطنطنیہ، بیروت، بیت المقدس اور مصر کا علمی سفر کیا اور وہاں کے کتب خانوں سے استفادہ کیا۔اور کالج ہی کے زمانہ قیام میں شمس العلماء کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔

علامہ شبلی مختلف الجہات شخصیت کے مالک تھے۔ان کی اس حیثیت کو بیان کرتے ہوئے حبیب الرحمٰن اعظمی لکھتے

> **''علامہ شبلی مختلف النوع کمالات کے مالک تھے یعنی وہ ایک عظیم شاعر، عظیم مفکر، عظیم مورخ اور عظیم انشاء پرداز تھے انہوں نے اسلامی تاریخ کو اس تحقیق و تنقیح کے ساتھ پیش کیا کی مستشرقین بھی دنگ رہ گئے۔آپ کی تصنیفات کی فہرست بڑی طویل ہے جن میں الجزیہ، الفاروق، المامون، شعر العجم، سیرت النعمان، سیرت النبی حصہ اول ،الغزالی، موازنہ انیس و دبیر، الکلام، مقالات شبلی، سفرنامہ روم ومصروشام وہ معرکۃ الآ**

راتصنیفات ہیں جن کی نظیر اردو کے علاوہ کم ہی ملے گی'' ۲۲؎

علامہ شبلی ایک عظیم محقق اور ایک عظیم مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ محبّ وطن اور ماہر تعلیم بھی تھے دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنو اور مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کی تعلیمی اور تنظیمی ترقیوں میں کارہائے نمایاں انجام دیئے، اوران کے نصاب تعلیم کو درست کیا ۔

زندگی کی آخری عمر میں دارالمصنفین کا خاکہ بھی مرتب کیا جس کی عمارت کے لئے اپنے آبائی باغ کو وقف کر دیا، مگر ابھی باقاعدہ طور سے دارالمصنفین کی بنیاد پڑی نہیں تھی کہ ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو دار فانی سے کوچ کر گئے ۔

علامہ شبلی نعمانی اعظم گڑھ کا وہ سپوت ہے جس کی دانشوری اور بصیرت کا اعتراف بین الاقوامی سطح پر کیا گیا، علامہ نے افکار ونظریات کی سطح پر ہر طرح کے ظلم، استحصال اور ناانصافی کا مقابلہ کیا انہوں نے پورے ملک میں تعلیمی بیداری کی روح پھونکی، سیاسی بصیرت کو عام کیا اور برطانوی استعمار کی چیرہ دستیوں، اس کے فریب اور ظلم کو دلائل و براہین سے بے وقعت ثابت کیا۔ یہ شبلی کی سیاسی بصیرت ہی تھی کہ انہوں نے ملک کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی سطح پر ظلم واستحصال اور ناانصافی کو نہ صرف اجاگر کیا بلکہ اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، اس کے خلاف نظمیں لکھیں، تقریریں کیں اور بوقت ضرورت عملی اقدام بھی کیا۔ ان کی وفات ہوئے ایک صدی کا عرصہ بیت چکا مگر اب تک برصغیر اس جیسا اسکالر نہیں پیدا کر سکا۔ علامہ شبلی نے تنہا جو علمی اور ادبی کام کیا اسے بڑی بڑی اکیڈمیاں نہیں کر سکیں۔

مولانا محمد عثمان ساحر مبارکپوری

مولانا محمد عثمان ساحر مبارکپوری ۱۹۱۴ء میں قصبہ مبارکپور ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ مولانا اپنے قصبہ کی مشہور درسگاہ جامعہ عربیہ احیاء العلوم سے فارغ التحصیل تھے۔ انہیں صرف ونحو اور ادب وتفسیر کے علاوہ علم حدیث سے بڑی دلچسپی تھی۔ اس میں پختگی اور درک پیدا کرنے کے لئے مرادآباد گئے۔ اس حوالہ سے'' تذکرۂ علماء اعظم گڑھ'' میں مذکور ہے کہ'' دورۂ حدیث پڑھنے کے لئے مرادآباد گئے۔ (مدرسہ شاہی) مرادآباد میں داخلہ لے کر حضرت مولانا فخر الدین مرادآبادی سے صحیح بخاری، سنن ابی داود

،سنن ابن ماجہ اور حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی ثم دہلوی سے سنن ترمذی اور مولانا محمد اسمعیل سنبھلی سے صحیح مسلم وغیرہ کتب حدیث پڑھ کر فاتحہ فراغ پڑھی اور فضیلت حاصل کی۔

فراغت تعلیم کے بعد مسند تدریس کو زینت بخشی اور مختلف مدارس میں درس وتدریس کا فریضہ انجام دینے کے ساتھ ساتھ جون پور میں مسجد لال دروازہ میں مولانا محمد اسلم بھوری کی رفاقت میں ''جامعہ حسینیہ'' کے نام سے ۱۳۹۴ھ میں ایک مدرسہ قائم کیا۔ جہاں گیارہ بارہ برس تک بڑے انہماک سے تعلیمی وتدریسی خدمات انجام دیں۔ حالات سازگار نہ ہونے کی وجہ سے مدرسہ چھوڑ کر گھر چلے گئے، پھر مدرسہ منبع العلوم خیرآباد کے ارباب اہتمام کی طلب پر اورخواہش پر ۱۴۰۵ھ مطابق ۱۹۸۴ء کو منبع العلوم میں بحیثیت صدر مدرس آ گئے اور تاحیات اسی مدرسہ میں رہے

پوری عمر علم وفن کی گراں قدر خدمت انجام دے کر اسلام کا یہ مخلص ۲۱ اپریل ۱۹۹۳ء کو اس دار فانی سے دار جاودانی کو سدھار گیا۔ مولانا اردو اور عربی دونوں کے بلند پایہ ادیب اور قادر الکلام شاعر تھے۔ اردو کی ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی تھی۔ ساحر تخلص بھی رکھا تھا۔ مولانا تصنیف وتالیف کے میدان سے بھی آشنا تھے۔ ان کے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

رخ پر گیسو ترے بل کھائے ہوئے البیلے — سانپ مہتاب سے ہے آنکھ مچولی کھیلے
آؤ ہنس بول لیں کل جانے کہاں کون رہے — دائمی ہوتے نہیں جان جہاں یہ میلے
لے لے یہ جنس گراں قدر پس وپیش نہ کر — جس جگہ جیسے ملے درد محبت لے لے

عزم سہریاوی

سرزمین اعظم گڑھ کا ایک اہم نام ابوالفیض عزم سہریاوی ہے جن کے اشعار ندرت فکر اور جدت اظہار کی گواہی دیتے ہیں۔ اور جنہوں نے خود کو مخصوص موضوعات کا پابند نہیں بنایا بلکہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے سخن کو آسمان کیا اور شبد ستاروں سے ایک کہکشاں سجائی ہے

عزم سہریاوی نے حیات اور کائنات کے اسرار کو اظہار کا پیکر عطا کیا ہے۔ ان کے یہاں زندگی اپنی مختلف شکلوں میں رونماں ہوتی ہے۔ ان کے چند اشعار سے ان کے فکری کینوس کو بآسانی سمجھا

جاسکتا ہے

کبھی مندر میں پروہت کبھی گرو دوارے میں سنت
ہم نے دیکھا ہے اسے روز ایک ہرمت کی طرح
اس پہ اے عزم بھروسہ بھی کریں تو ک
رنگ ہر روز بدلتا ہے جو گرگٹ کی طرح

....

یہ بستی ہے نئے لو گو ں کی شاید
یہاں پہونچا شاید کو ئی نہیں ہے
مری باتوں کے قائل تو سبھی ہیں
مگر اب مانتا کوئی نہیں ہے

عزم سہریاوی نے لسانی سطح پر بھی کچھ الگ تجربے کیے ہیں جو دوہے کی شکل میں سامنے آئے ہیں۔ یہ دوہے ان کی فکری جزالت اور لسانی لطافت کا خوبصورت ترین نمونہ ہیں۔

ہے مورکھ ناداں تو سو کھے پیڑ سمان
پات، پشپ جس پر نہیں پھل سے بھی اگیان
پشپ بھانت ادھرو ں پر سائیں سبھی رہے مسکان
مانو شریشٹھ یہی ہے جس کا جیون دیپ سمان

عزم سہریاوی کہنہ مشق شاعر ہیں ان کا حمد و نعت کا مجموعہ کلام ''سحاب رحمت'' کے نام سے بہت مقبول ہے۔ ''طلوع سحر'' ان کی غزلیات کا مجموعہ ہے جس میں وہ اپنے غزلیہ آہنگ میں مختلف اور معتبر انداز میں سامنے آتے ہیں

راہل سانسکرتاین

راہل سانسکرتاین کا نام پوری دنیا میں قدر و منزلت کی نگاہ سے جانا پہچانا جاتا ہے دنیا نے انہیں ایک مفکر اور دانشور کی حیثیت سے تسلیم کیا۔ ادب، سماج اور سیاست میں ایک ایسی لہر پیدا کی کہ دنیا عش

عش کرنے لگی۔تقریباوہ تیس زبانوں کے ماہر تھے۔انہوں نے سب سے بڑا جوکارنامہ انجام دیاوہ یہ کہ سنسکرت میں تبّتی زبان کا قاعدہ مرتب کیااور عالمی سطح پراپنی قابلیت کے جوہر دکھائے۔

’’گنگا سے اولگا‘‘ تک لکھنے والے سچے انسان دوست تھے انہوں نے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھیں۔سفر نامہ،تاریخ ،لسانیات،عمرانیات،سیاسیات اور فلسفہ ان کی دلچسپی کے موضوعات تھے۔جنہوں نے اپنے پورے عہد کی سماجی،سیاسی اور علمی تاریخ مرتب کر دی ہے۔مدھیہ ایشیا کا اتہاس، رگ وید، آریہ، اکبر اور بھارت کے انگریزی راج کی سنستھا یک ان کی نہایت گراں قدر تصنیفات ہیں۔

کیفی اعظمی

اعظم گڈھ کا ایک روشن نام کیفی اعظمی بھی ہے جنہوں نے زندگی بھرانسانیت کے درد کو اپنے سینے میں محسوس کیااوراس درد کی ترسیل کی۔وہ ترقی پسند تحریک کے آخری سپہ سالار تھےان کی آنکھوں میں جو خواب تھے بہت مقدس تھے وہ سچ مچ ایک عظیم انسان تھے جس نے بحرظلمات میں اپنے روشن فکر کے گھوڑے دوڑائے اور انسانی شعوراوراحساس کوایک ایساوژن دیا جس میں انسانیت کی فلاح و بہبود مضمر تھی کیفی اعظمی کا تعلق ایک ایسے انقلابی قافلے سے رہا ہے جس کی آنکھوں میں نئے انسان کے خواب نئے عہد کی بشارتیں تھیں۔کیفی اعظمی کی شاعری میں انسانی دردمندی کے چراغ روشن تھےان کی شاعری کمزورطبقات مزدوراورمحنت کشوں کے درد سے بھری ہوئی ہے۔

مولانا سلامت اللہ

اعظم گڈھ کی علمی تاریخ میں ایک اہم نام مولانا سلامت اللہ علیہ الرحمہ کا ہے آپ کا وطن جیراج پور ہے،علامہ شبلیؒ کا مولد بندول ہےاوراسی سے بالکل متصل سرزمین جیراجپور نے بھی چوٹی کے علماء پیدا کئے۔مولانا سلامت اللہ جیراجپوری کوان میں امتیازی حیثیت حاصل ہے آپ غیر مقلد تھے،آپ سے پہلے بھی شاید اعظم گڑھ میں غیر مقلد رہے ہوں۔خود علامہ شبلی کے ماموں مولانا اسلمؒ فراہی غیر مقلد تھے ۔لیکن مولانا سلامت اللہ نے باقاعدہ طریقے سے اعظم گڑھ میں ترک تقلید کی تحریک شروع کی۔آپ

بڑی متحرک شخصیت کے مالک تھے۔آپ کی فطرت میں اجتہاد و تجسس کو بڑا دخل تھا،مزاج کی سیمابیت کسی مسئلہ کی یکسوئی ہونے تک چین سے نہیں بیٹھنے دیتی تھی،آپ کے دم سے اعظم گڈھ میں مناظرہ کا بازار گرم ہوا اور سوالات و جوابات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:۔

''مولانا سلامت اللہ صاحب نے پہلے جون پور کے مدرسہ میں جا کر مفتی محمد یوسف صاحب سے علوم کی تکمیل کی پھر بنارس میں پڑھا اور دہلی پہونچ کر مولانا سید نذیر حسین صاحب سے حدیث پڑھی،اور اس کے بعد نہایت انہاک کے ساتھ اپنے وطن واپس آ کر ترک تقلید اور آمین بالجہر،رفع یدین اور قرآت فاتحہ خلف الامام وغیرہ مسائل کی اشاعت کے لئے وعظ و تبلیغ شروع کی نتیجہ یہ ہوا کی اعظم گڑھ کے اطراف میں تقلید و عدم تقلید اور فقہی مسائل کا شور مچ گیا۔مولانا سلامت اللہ صاحب آخری عمر میں بھوپال چلے گئے اور نواب صدیق حسن خان نے ان کو وظیفہ عطا کیا تھا،اور بھوپال کے بعض مدرسوں کی خدمت سپرد کی تھی'' ۲۲؎

اسلم جیراج پوری

اعظم گڑھ کی خاک کے وہ ذرے جن کو ان کی رفعت فکر و نظر نے ہمدوش ثریا کیا ان میں علامہ اسلم جیراج پوری بڑی شان کے مالک ہیں۔آپ کے والد کا ذکر گذشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔بلندی فکر اور رفعتِ فن آپ کا موروثی حق تھا۔آپ نے زندگی کا بیشتر حصہ تصنیف و تالیف میں گزارا اور مختلف النوع موضوعات کو اپنے شگفتہ قلم سے زندگی و تابندگی بخشی،جغرافیائی اعتبار سے آپ کا وطن اور علامہ شبلی کا وطن متصل ہے۔لیکن میدان فکر و عمل اور طبع و مزاج میں دونوں بزرگوں کے مابین بعد مشرقین ہے۔آپ کی فطرت میں شعلہ طبعی اور متلون مزاجی نہ تھی بلکہ خود اپنے والد کی مناظرانہ صفت بھی آپ میں نہ تھی ۔آپ کی فطرت متانت و سنجیدگی کے ساتھ اعتماد و وقار کا نمونہ تھی۔آپ نے اپنی ذہانت،مطالعہ اور تخلیقی قوت کے ثبوت کے طور پر تقریبا دو درجن کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔آپ نے فارسی شعراء کو اپنے قلم کا موضوع بنایا،''حیات حافظ''اور''حیات جامی''اس کا بہترین نمونہ ہیں۔خصوصا''حیات حافظ''ان کے

تنقیدی شعور کا شاہکار ہے۔ آپ نے خود حافظ کے اشعار کی روشنی میں انہیں سنی قرار دیا ہے۔ جب کہ ان کے بارے میں یہ بحث متنازعہ فیہ رہی ہے کہ وہ سنی تھے یا اہل تشیع۔ آپ کا یہ عمل آپ کی عمیق نگاہی پر دلالت کرتا ہے۔ مزید براں جس انداز سے ''میں'' اور ''دل'' کے مکالمے کے ذریعے فال کا جواز پیش کیا ہے یہ ان کی ذہانت وقابلیت کے ساتھ ساتھ ان کی آزادخیالی اور وسیع المشربی کی علامت ہے، آپ کے والد مولانا سلامت اللہ نے تو اعظم گڑھ میں ترک تقلید کی بنیاد ڈالی تھی۔ آپ کی آزادی اور جدت پسندی ایک قدم اور آگے نکلی۔ آپ کے بارے میں اعظم گڑھ میں مشہور ہے کی فرقہ اہل قرآن کے بانی آپ ہی تھے اور منکرین حدیث میں سے تھے۔

آپ کے فرقہ اہل قرآن کے بانی ہونے کو معتبر شہادت تو نہیں دستیاب ہوسکی۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ آپ حدیث سے دور ہوگئے تھے چنانچہ فرماتے ہیں۔

> **''دفعتہً حدیث کی بھی حالت سامنے آگئی کہ وہ بھی مرکز سے نہیں ملی ہے یعنی رسول اللہ ﷺ یا آپ کے صحیح جانشینوں نے اس کا کوئی مجموعہ مرتب کر کے امت کے حوالے نہیں کیا ہے بلکہ تمام تر روات سے ملی ہیں جنہوں نے رضا کارانہ اس کو روایت کیا اور جن کی کوئی مرکزی حیثیت نہیں تھی۔ اس حقیقت پر نظر پڑتے ہی میری روح لرز اٹھی اور میں نے کہا یا اللہ سوائے تیری کتاب کے کہیں پناہ نہیں ہے۔ جیسا کہ تو نے فرمایا ہے: ولن تجد من دونه ملتحدا .... جب قرآنی حقائق میرے دل پر اللہ نے کھولے اس وقت حدیث کی اصلی حیثیت بالکل واضح ہوگئی وہ دینی تاریخ ہے خود اس کو دین سمجھنا صحیح نہیں۔ اگر دین ہوتی تو رسول اللہ ﷺ قرآن کریم کی طرح اس کو بھی لکھوا کر امت کو دے جاتے۔ دین کے لیے قرآن کافی ہے۔ جو کامل کتاب ہے اور جس میں دین مکمل کر دیا گیا ہے''۔[۲۳]**

علاوہ ازیں بہ استثناء قرآن دیگر مذہبی علوم کو آپ نے بحیثیت علم حاصل کیا۔ پیغمبر اسلام کی تعلیمات اور ''عبدہ'' کے موضوع پر آپ کے مضامین آپ کی ژرف نگاہی پر مغربی اور دیدہ وری کے

ثبوت کے باوجود عقائد سے کم اور فلسفیانہ نقطہ نظر سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں۔لیکن آپ کی ادبی حیثیت اورفنی مہارت کی داد نہ دینا ناانصافی ہے۔آپ کی کچھ تصانیف درج ذیل ہیں:

تاریخ القرآن ،حیات حافظ ،حیات جامی،الوراثۃ فی الاسلام ،(عربی زبان میں) تاریخ الامت (سات جلدوں میں) تاریخ نجد،عقائد اسلام،اورارکان اسلام وغیرہ۔

علامہ حمید الدین فراہی

اعظم گڑھ کی سرزمین سے ابھرنے والے نامور علماء میں علامہ حمید الدین فراہیؒ کا مقام بہت بلند ہے،آپ علامہ شبلی کے ماموں زاد بھائی تھے،علامہ شبلی آپ کی نکتہ سنجی اور فارسی دانی کے بہت مداح تھے،آپ کی انگریزی بہت اچھی تھی،شبلی نے جب قرآن کے مستند انگریزی ترجمہ کی ضرورت محسوس کی تو ان کی نظر انتخاب میں علامہ فراہی نہایت موزوں تھے گوکہ یہ کام انہوں نے اپنے ذمہ نہیں لیا،آپ اعلیٰ پائے کے مفسر قرآن تھے،باریک سے باریک تر نکات پر آپ نے نہایت گرہ کشائی کے ساتھ قلم اٹھایا ہے لیکن آپ کی تصانیف زیادہ تر عربی میں ہیں اور ادبی سے زیادہ عملی ہیں،بایں وجہ آپ کے چشمہ فیض سے اردوداں طبقہ سیراب نہ ہوسکا،علامہ شبلی کو آپ سے بہت امیدیں وابستہ تھیں،لیکن نہ جانے کیوں آپ نے اردوادب کو درخور اعتنا نہ سمجھا جس کا فطری نتیجہ یہ ہوا کہ اتنی ہمہ گیر شخصیت سے علمی دنیا خاطر خواہ فائدہ نہ اٹھاسکی،آپ کی عالمانہ حیثیت اس سے بھی ثابت ہوتی ہے کہ آپ علی گڑھ کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر،حیدرآباد میں پرنسپل کے عہدے پر فائز رہے۔آپ کی جامع الکمالات شخصیت میں علم وادب کے اتنے گوشے اور حکمت وبصیرت کے اتنے زاویے صرف فیضان رحمت ہی کہے جاسکتے ہیں ریاضت واکتساب کے ذریعہ ان مقامات عالیہ تک رسائی ممکن نہیں فیاضی قدرت آپ پر دل کھول کر مہربان ہوئی،آپ کی ہم پہلو ذہانت واستعداد پر فرط حیرت واستعجاب سے عقل سرنگوں اور تدبیر انگشت بدنداں رہ جاتی ہے،آپ کے سفر آخرت پر علامہ سید سلیمان ندوی نے جو وفیہ لکھا ہے اس کا ایک ایک لفظ اس پیکر علم وفن کا آئینہ دار ہے،

’’الصلوۃ علی ترجمان القرآن‘‘(مفسر قرآن کی نماز جنازہ) وہ صدا ہے جو آج سے

ساڑے چھ سو برس پیشتر مصر و شام سے چین کی دیوار تک ابن تیمیہ کی نماز جنازہ کے لئے بلند ہوئی، حق یہ ہے کہ یہ صدا آج بھی بلند ہو اور کم از کم ہندوستان سے مصر و شام تک پھیل جائے کہ اس عہد کا ابن تیمیہ (۱۱ نومبر ۱۹۳۰ء، ۱۹ جمادی الثانی ۱۳۴۹ھ) اس دنیا سے رخصت ہو گیا جس کی مشرقی و مغربی جامعیت عہد حاضر کا معجزہ تھی، عربی کا فاضل یگانہ اور انگریزی کا گریجویٹ زہد وورع کی تصویر، فضل و کمال کا مجسمہ، فارس کا بلبل شیراز، عربی کا سوق عکاز ایک شخصیت مفرد لیکن ایک جہاں دانش ایک دنیائے معرفت ایک کائنات علم، ایک گوشہ نشین، مجمع کمال، ایک بے نوا سلطان ہنر، علوم ادبیہ کا یگانہ علوم عربیہ کا خزانہ، علوم عقلیہ کا ناقد، علوم دینیہ کا ماہر، علوم قرآن کا واقف اسرار، قرآن پاک کا دانائے رموز،.........وہ ہستی جو تیس برس کامل قرآن پاک اور صرف قرآن پاک کے فہم و تدبر اور درس و تعلیم میں محو ہر شے سے بیگانہ اور ہر شغل سے نا آشنائی تھی۔ افسوس کہ اس کا علم سینہ سے سفینہ میں بہت کم منتقل ہو سکا، مسودات کا دفتر چھوڑا ہے مگر افسوس کہ اس کو سمجھنے اور ربط نظام دینے کا دماغ اب کہاں، جو چند رسالے چھپے وہ عربی میں ہیں جن کے عوام تو کیا علماء تک ناقدر شناس'' [۲۴]

آپ کی عربی غزل کے دو اشعار پیش خدمت ہیں:

سر مع العقل این ما سارا
درمع الحق حیث ما دارا
لا تھو لنك ليلة عكرت
ان بعد الظلام انوارا

شیخ نور محمد کامیابؔ

اسی عہد کے فیض یافتہ شیخ نور محمد کامیاب صبرحدی اپنے وقت کے کامیاب شاعر و ادیب اور عالم و بزرگ تھے۔ صبرحد ضلع جون پور کی تحصیل شاہ گنج میں ایک مشہور موضع ہے نور محمد اسی موضع کے رہنے

والے تھے ۔مگر بعد میں اعظم گڑھ کے موضع بھادوں میں چلے آئے، جہاں ان کی سسرال تھی اور باقی زندگی وہیں گزاری ۔ یہ ''گرم دیوان'' کے مرید اور خلیفہ شمس الدین حیدری مرتب ''مناقب غوثی'' کے داماد بھی تھے۔

''صوفی نور محمد'' کی دو شعری تصانیف ''انوردگ ہانسری'' اور ''اندرلوتی'' ہندی ادبیات میں بڑی وقیع حیثیت رکھتی ہیں ۔ان دونوں کی زبان اودھی ہے اور جائسی کی پدماوت کی طرز پر لکھی گئی ہیں۔ یہ فارسی اور عربی کے اچھے شاعر تھے۔ فارسی میں کامیاب تخلص کرتے تھے ان کی فارسی غزلوں کا ایک دیوان بھی ہے۔

ان حضرات کے علاوہ اور کئی اہم نام شعر و ادب، علم وفن، تحقیق وتصنیف اور صحافت کی دنیا میں مقام اعتبار تک پہونچے ہیں جیسے رحمت الٰہی برق، عزم سہروردی، سبط حسن، فہیم اعظمی، نجم الحسن رضوی، فضا اعظمی اقبال سہیل، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا اختر احسن اصلاحی، مولانا صدر الدین اصلاحی، مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی، مولانا جلیل احسن ندوی، مولانا مجیب اللہ ندوی، ابو المجاہد زاہد، مولانا ضیاء الدین اصلاحی، مولانا نجم الدین اصلاحی، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی، مولانا وحید الدین خان، ڈاکٹر ناطق اعظمی اور ڈاکٹر ظفر الاسلام وغیرہ ایسے نام ہیں جو کہ ہندوستان سے باہر کی سرزمین میں اپنے افکار وخیالات کی وجہ سے جانے جاتے ہیں۔

اعظم گڈھ کی سرزمین نے ادبی تنقید کو بھی کئی معتبر نام دیے ہیں جن کے بغیر اردو کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔شبلی تو تنقید کا ایک بڑا نام ہے ہی، بعد میں خلیل الرحمٰن اعظمی اور احتشام حسین جیسی شخصیتوں نے تنقیدی افق کو تابانی عطا کی اور اپنے تنقیدی نظریات سے اردو کے سرمایہ نقد میں گراں بہا اضافے کیے، پروفیسر خلیل الرحمٰن اعظمی کی کتاب ''اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک'' ایک حوالہ جاتی حیثیت رکھتی ہے تو مارکسی نقاد احتشام حسین کی کئی تنقیدی کتابیں ہیں جن میں وہ اپنے تنقیدی تشخص کے ساتھ نظر آرہے ہیں۔تنقیدی جائزے، روایت اور بغاوت، ادب اور سماج، تنقید اور عملی تنقید، ذوق ادب اور شعور، اردو ادب کی تنقیدی تاریخ ، یہ وہ کتابیں ہیں جن سے احتشام حسین کی سماجی تنقید کے زاویے روشن

ہوتے ہیں اوران کی انفرادیت واضح ہوتی ہے۔انہوں نے ایک بہت اچھی بات لکھی ہے کہ قدیم ادب ہمارے لیے صرف ایک مقدس ترکے کی حیثیت سے قابل احترام نہیں ہے بلکہ اس میں فطرت اور سماج کی رجعت پسند طاقتوں پر قابو پانے کی جس جدوجہد کا مظاہرہ شعوری یا غیر شعوری طور پر ہوتا ہے۔اس سے انسانی شعور کی تاریخ مرتب ہوتی ہے۔منظر اعظمی بھی تنقید کا ایک بڑا نام ہے۔جن کی کتاب اردو ادب کے ارتقا میں تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ عصری دانش گاہوں میں ماخذ اور مرجع کی حیثیت سے استعمال کی جاتی ہے۔ڈاکٹر افغان اللہ بھی اردو کے اہم ناقد ہیں۔وہ گورکھپور یونیورسٹی کے صدر شعبہ اردو رہے انہوں نے فراق کی شاعری پر بہت عمدہ کام کیا ہے۔

اعظم گڑھ کے چند نمایاں مدارس

امت کی تاریخ میں مدارس اور مکاتیب کی اتنی اہمیت ہے جتنی کی انسانوں کے لیے کھانے پینے اور ہوا کی۔ جہاں جہاں اور جن علاقوں میں دینداری پائی جاتی ہے اور وہاں کے لوگ اسلامی تشخصات اور دینی تہذیب کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔ان کے بارے میں یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اس کے پیچھے مدارس اور مکاتب کا ہاتھ ہے۔ورنہ جہاں ان کا سلسلہ نہیں ہے وہاں ضلالت و گمرہی اور جہالت نے پاؤں پھیلا لیے ہیں۔

ایسے مظاہر کا ایک اعلی نمونہ سرزمین اعظم گڈھ بھی ہے جہاں مدارس کا جال بچھا ہوا ہے۔گاؤں گاؤں مکاتب پائے جا رہے ہیں۔اس مردم خیز ضلع کو یہ خصوصی امتیاز حاصل ہے آج ضلع میں جتنے مدارس ومکاتب ہیں شاید ہی ہندوستان کے کسی علاقے میں ہوں۔

مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارکپور، جامعہ اشرفیہ مبارکپور، جامعۃ الفلاح بلریا گنج، بیت العلوم سرائے میر، جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ، جامعہ اسلامیہ مظفر پور تھنولی، جامعہ امام مہدی اعظم گڈھ، فیض عام دیوگاؤں، جامعہ اشرفیہ لونیہ ڈیہہ وغیرہ یہاں کے مرکزی مدارس ہیں۔

مدرسۃ الاصلاح سرائے میر

اس مدرسہ کے بانی مولانا محمد شفیع ہیں، ۱۹۰۸ء میں اس مدرسہ کی بنیاد رکھی گئی، اس کے فکری بانی

علامہ شبلی نعمانی ہیں، مولانا شفیع صاحب نے علامہ شبلی سے یہ درخواست کی تھی کہ وہ مدرسہ کی رہنمائی وسر پرستی فرمائیں، علامہ اس وقت ندوۃ العلماء لکھنؤ کے معتمد تعلیمات تھے، انہوں نے فوراً علامہ حمید الدین فراہی کو ایک خط لکھا کہ کیا تم سرائے میر کے مدرسہ میں چند روز قیام کر سکتے ہو؟ میں شاید آؤں اور اس کا نظم ونسق درست کر دیا جائے۔

چنانچہ انہیں دونوں بزرگوں نے اس کے نصاب تعلیم کو وضع کیا۔ لہذا اس مدرسہ کو جو چیز دوسرے مدرسے ممتاز کرتی ہے وہ قرآن مجید کی محققانہ تعلیم ہے، اس مدرسہ کا اپنا وضع کردہ نصاب تعلیم ہے۔ دینی تعلیم کے ساتھ عصری علوم بھی پڑھائے جاتے ہیں، مدرسہ کا کتب خانہ بڑا وسیع ہے، طلبہ کی علاحدہ لائبریری دارالمعلومات کے نام سے ہے ''ماہنامہ الاصلاح'' بند ہونے کے بعد چند برسوں سے سہ ماہی ''نظام القرآن'' کے علاوہ طلبہ کا سالانہ ''مجلّہ'' بھی پابندی سے نکل رہا ہے۔ اس کے علاوہ حکیم محمد مختار اصلاحی پالی ٹیکنک قائم کیا گیا ہے، جس کا مقصد طلبہ کو ضروری علوم اور کارآمد صنعتوں کی تعلیم سے آراستہ کرنا ہے۔ اور مولانا فراہی کے نام پر دائرہ حمیدیہ بھی قائم ہے۔ اس مدرسہ کے موجودہ ناظم اشفاق احمد اصلاحی ہیں۔

جامعۃ عربیہ احیاء العلوم، مبارکپور

محمد آباد کے قریب مبارکپور بڑا قصبہ ہے جو عہد قدیم سے پارچہ بافی کا مرکز ہے اور اس قصبہ میں چند نامور علماء پیدا ہوئے ہیں مثلاً مولانا عبیداللہ، قاضی اطہر مبارکپوری، مولانا عبدالرحمٰن، مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری وغیرہ، اس قصبہ میں دو قدیم مدارس معروف ومشہور ہیں۔ اول احیاء العلوم دوم جامعہ اشرفیہ، رہا اول تو سو سال سے زائد عرصہ سے تعلیم وتدریس میں مشغول ہے ابھی چند سال پہلے اس نے اپنا صد سالہ جشن نہایت اہتمام سے منایا تھا۔

جامعہ اشرفیہ، مبارکپور

یہ بریلوی مکتب فکر کا حامل ہندوستان کا سب سے بڑا مدرسہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کی بنیاد ۱۹۰۸ء میں چند مخلص مسلمانوں نے رکھی تھی۔ جامعہ نے جن بڑے نامور علماء وفضلاء کو پیدا کیا ان میں سے چند

ممتاز نام یہ ہیں ۔مولانا ظفر حسین ایہی ، بحرالعلوم مفتی عبدالمنان اعظمی ،سید اشرف کچھوچھوی ، علامہ ارشدالقادری اور شارح بخاری محمد شریف الحق امجدی وغیرہ۔

جامعۃ الفلاح،بلریا گنج

۱۹۱۴ء ہی سے ایک مکتب کی حیثیت سے اس کی داغ بیل پڑ گئی تھی ۔ پہلے اس کا نام مکتب اسلامیہ تھا۔۱۹۵۹ءمیں اس کا نام جامعہ اسلامیہ رکھا گیا اور ۱۹۶۲ءاس کا نام بدل کر جامعۃ الفلاح ہوگیا

جامعۃ الفلاح جماعت اسلامی ہند کا ایک نمائندہ مدرسہ ہے، اس کے موجودہ ناظم مولانا طاہر مدنی ہیں اور شیخ الجامعہ کی حیثیت سے مولانا سید جلال الدین عنصر عمری موجودہ امیر جماعت اسلامی ہند ہیں،اس میں تقریباساڑھے چار ہزار سے زائد طلبہ اور طالبات زیر تعلیم ہیں،اس کا بھی اپنا ایک جداگانہ نصاب تعلیم ہے۔ یہاں شعبہ نسواں بھی قائم ہے،اس میں فضیلت تک لڑکیوں کی تعلیم ہوتی ہے، جامعہ سے مجلّہ ''حیات نو'' سہ ماہی نکلتا ہے۔

بیت العلوم،سرائے میر

اس کے بانی مولانا عبدالغنی پھولپوری ہیں ۔مولانا پھولپوری مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ کے استاد تھے اور بعض اختلاف کی وجہ سے وہاں سے علاحدہ ہوگئے اور سرائے میر ہی میں ایک مدرسہ کی بنیاد ۱۹۳۰ء میں رکھی ، یہی مدرسہ بیت العلوم کے نام سے مشہور ہے اس وقت اس مدرسہ میں دورۂ حدیث تک کی تعلیم ہوتی ہے،مجلّہ ''فیضان اشرف''اس کا ترجمان ہے اس کی بنیاد مولانا اشرف علی تھانوی نے رکھی تھی ۔مولانا پھولپوری ان کے خاص مریدوں میں سے تھے۔اس مدرسہ سے جن جلیل القدر علماء نے فیض اٹھایا ان میں مولانا مسعود خان منگراواں ،مولانا عبدالحق صاحب جگدیشپوری شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند،مولانا منظور احمد مفتی شہر کانپور مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی استاد حدیث دارالعلوم دیوبند وغیرہ ہیں۔

یہ رہا اعظم گڈھ کے نمائندہ مدارس کا مختصر تعارف ، ان کے علاوہ بے شمار مکاتب و مدارس ہیں جن کی خدمات سے ہرگز انکار نہیں کیا جاسکتا۔اور ہندوستانی مسلمانوں کے تقریبا تمام مکاتب فکر کے

مذہبی ادارے یہاں موجود ہیں ۔ یہاں کے مدارس کا ایک بڑا امتیاز یہ ہے کہ وہ مذہبی تعلیم ہی فراہم نہیں کرتے بلکہ ان کی اکثریت نے سماجی ضرورتوں کو دیکھتے ہوئے اپنے یہاں دیگر عصری علوم بھی نصاب میں شامل کئے ہیں ۔اس کے علاوہ یہاں چھوٹے چھوٹے مقامات پر بھی انگلش میڈیم اسکول اور کالج موجود ہیں ۔شبلی کالج کے علاوہ D.A.V اور S.K.P ڈگری کالج ، ابن سینا طبیہ کالج بینا پارہ ،منگراواں ڈگری کالج اور فاطمہ گرلس انٹر کالج داؤد پور وغیرہ اعظم گڈھ کی علمی ترقی کو پروان چڑھا رہے ہیں۔

حواشی

۱- علامہ سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، معارف پریس اعظم گڈھ،۱۹۸۳ء
۲- مرزا انصار بیگ، اعظم گڑھ تاریخ کے آئینہ میں، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی،۲۰۱۳ء،ص۱۷
۳- ڈاکٹر حبیب اللہ، اعظم گڑھ کا علمی، ادبی اور تاریخی پس منظر، اسلامک بک فاؤنڈیشن، حوض سوئیوالان، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲،۲۰۱۴ء ص۱۶
۴- عبد الحلیم شرر لکھنوی ، مرتب ، رشید حسن خان ، گزشتہ لکھنو ، مکتبہ جامعہ دہلی، ستمبر ۱۹۷۱ء ص۷۶،۷۷
۵- ایضا
۶- حبیب الرحمٰن اعظمی، تذکرہ علماء اعظم گڑھ، مرکز دعوت وتحقیق دیوبند،۲۰۱۲ء،ص۴۵، ۴۶
۷- شیخ عبدالرحمٰن، مرآۃ الاسرار، ذکر سلطان الشہدا امیر مسعود، جلد۱
۸- مولوی محمد صادق، خلاصہ تاریخ مسعودی، مطبوعہ غالب الاخیار، ۱۲۸۸ھ،ص۷
۹- حبیب الرحمٰن اعظمی، تذکرہ علماء اعظم گڑھ، مرکز دعوت وتحقیق دیوبند،۲۰۱۲ء،ص۴۸
۱۰- ایضا ص۶۱،۶۲
۱۱- حیات شبلی
۱۲- اعظم گڈھ کا علمی، ادبی اور تاریخی پس منظر
۱۳- نواب محمد غوث خان بہادر، تذکرۂ صبح وطن، کشن راج مدارس، ۱۲۵۹ھ ص۵۷
۱۴- اسعد عباسی، شمیم عشرت، دیپاچہ از اقبال سہیل، ص۴۶
۱۵ اعظم گڈھ کا علمی، ادبی اور تاریخی پس منظر
۱۶- مولانا عبدالحی، نزہتہ الخواطر، جلد۷، ص۴۵
۱۷- رحمان علی تذکرۂ علماء ہند، ص۱۴۲،۱۴۳
۱۸- ایضا

۱۹- محمد عثمان معروفی، مشاہیر پورہ معروف
۲۰- فیاض گوالیاری وقمر الزماں مبارک پوری، صدر جنگ، ۱۹۷۰ء، ص ۱۳۹
۲۱- تذکرہ علماء اعظم گڑھ، ص
۲۲- حیات شبلی،
۲۳- ایضاً
۲۴- اقبال اور علماء پاک وہند صفحہ ۳۷۰-۳۷۱
۲۵- ڈاکٹر خورشید نعمانی، دارالمصنفین کی ادبی خدمات ص ۳۱۸

باب دوم

اعظم گڑھ میں اردو شاعری کے ارتقاء کی ایک مختصر تاریخ

فصل اول: انور اعظمی سے پہلے کی اردو شاعری

فصل دوم: انور اعظمی کے دور میں اردو شاعری

انور اعظمی سے پہلے کی اردو شاعری

اعظم گڑھ کے صفحہ ہستی پر نمودار ہونے تک اردو نوزائیدہ تھی۔اس کے نثری سرمائے کا ذخیرہ اگرچہ قابل ذکر تو نہیں ہے لیکن اردو شاعری ارتقاء کے اعلی مدارج طے کر چکی تھی۔اوراس وقت کے ہزاروں اشعار ایسے ملتے ہیں جو سلاست وصفائی اورصحت زبان کی حیثیت سے آج کے اشعار کے ہم پلہ نظر آتے ہیں۔یہ وہ زمانہ تھا جب ولی دکنی کا دیوان دہلی پہنچ چکا تھا۔اورشمال کے لوگوں کے سامنے ولی کی شکل میں ایک ایسا شاعر آچکا تھا،جس کے کلام نے یہ ثابت کر دیا کہ اردو بلند سے بلند فکر کو اظہار کا خوبصورت جامہ عطا کرنے کی طاقت رکھتی ہے۔ولی کی پیش کردہ زبان اتنی دلکش ودلنشین تھی کہ شعراء شمال کا ذوق جمال فارسی کی تمام سحر طرازیاں بھول گیا اوراس دیسی والبیلی زبان کواپنے گلے سے لگالیا۔لیکن ابھی خطہ اعظم گڑھ پر فارسی وعربی میں فکروفن کے جادو جگائے جاتے تھے یا برج اوراودھی میں شاعری کی جاتی تھی اس وقت بھی اعظم گڑھ کے شعراء میں شاعری کا عمدہ ذوق تھا خود راجہ اعظم خاں ثانی اودھی کے پلند پایہ شاعر تھے"سنگار درپن"اس کا بہترین نمونہ ہے۔

اس زمانے کے مسلم علمائے ادب کا شعری سرمایہ زیادہ تر عربی وفارسی میں ہے اس وقت کے علمائے کرام کے بارے میں یہ بات کسی مبالغے کے بغیر کہی جاسکتی ہے کہ سرزمین اعظم گڑھ نے علامہ شبلی سے قبل ہی ایسے پائے کے اہل کمال پیدا کر دئے تھے کہ ان کی عربی وفارسی شاعری رشک عرب وفارس ہے۔لیکن اس کے ساتھ یہ المیہ ہے کہ آج کل عربی وفارسی کی ناواقفیت کی بناپر ان علماء کی کاوشیں گلدستہ طاق نسیاں ہو کر رہ گئیں۔حالانکہ علامہ شبلی کے استاذ مولانا فاروق چریا کوٹی نہ صرف عربی وفارسی کے بلند پایہ شاعر تھے بلکہ موسیقی کے نہایت دلدادہ تھے۔اوراکثر اپنے شاگرد عزیز مولانا شبلی کو بھیروی سناتے تھے۔اس وقت کے علماء میں ہر عالم اس لائق ہے کہ اس کی ادبی حیثیت پر ایک مستقل کتاب لکھی جائے۔اگر صرف ان کے اسمائے گرامی نقل کئے جائیں تو کافی طویل فہرست ہوگی۔لیکن بہ خوف

طوالت ان کو قلم انداز کیا جاتا ہے۔ یوں تو اس سے قبل بہت سے شعراء گزرے ہیں لیکن محدود ذرائع اور طوالت کے ڈر کے باعث علامہ فاروق چریاکوٹی اور دیگر چند اہم شعراء کے بارے میں معلومات پیش کی جارہی ہیں تاکہ اعظم گڑھ کی شعری فضا کا اندازہ کیا جاسکے۔

مولانا فاروق چریاکوٹی

مولانا فاروق چریاکوٹی جامع الکمالات تھے۔عربی وفارسی دونوں زبانوں کے بلند پایہ شاعر وادیب تھے ۔آپ بیک وقت ایک قادرالکلام شاعر، صاحب طرز نثر نگار، معتبر فقیہ، ایک قابل ریاضی داں، ماہر علوم معقول ومنقول، بہترین موسیقار اور ایک کامیاب وکیل تھے ۔درس وتدریس میں یگانۂ روزگار تھے ۔شاگردوں کی نفسیات پر گہری نظر تھی۔طرز تدریس اتنا سلجھا ہوا اور دلکش تھا کہ ایک ایک لفظ خانۂ دل میں جاگزیں ہوجاتا تھا۔سید سلیمان ندویؒ رقم طراز ہیں:

''ان کے طرز تعلیم کی خاص خصوصیت یہ تھی کہ وہ کتاب سے علیحدہ ہوکر نفس مسئلہ کی ایسی تعلیم دیتے تھے کہ اس کا ہر گوشہ طالب علم کے سامنے روشن ہوجاتا تھا'' [۱]

مولانا فاروق چریاکوٹی نے اردو میں بھی شاعری کی ہے اور دو اردو مسدس یادگار چھوڑے ہیں'' حیات فاروقی'' اور'' مسدس عوالی''۔آپ کے کئی صاحبزادے تھے جن میں سے دو نے علم وفن میں کمال حاصل کیا۔ایک شمس العلماء مولانا محمد امین اور دوسرے مولانا مبین کیفی چریاکوٹی۔

آپ کے علوم وفنون پر روشنی ڈالتے ہوئے سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''مولانا فاروق صاحب کو علوم عربیہ کے علاوہ فارسی نظم ونثر میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا۔ اور اس زمانے کے کمالات کے مطابق صنائع وبدائع کا خاص شوق رکھتے تھے مثلاً غیر منقوط قصائد اور خطبے۔مولانا کی تصنیفات میں سے عربی وفارسی نظم ونثر کے بعض رسائل یادگار ہیں مثلاً منظومہ نحویہ، فارسی خالق باری، کشف الاقضاء عن وجوہ الامناع، اور تطلیقات ثلاثہ کی بحث پر ایک رسالہ جس کا قلمی نسخہ خود ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے'' [۲]

مندرجہ بالا اقتباس مولانا فاروق چریا کوٹی کی ہمہ جہت شخصیت پر دلالت کرتا ہے۔اس کے علاوہ علامہ شبلی نے اپنے استاذ کی شخصیت پر اس طرح خامہ فرسائی کی ہے۔

''مولانا موصوف چریا کوٹ کے رہنے والے تھے جو اعظم گڑھ میں ایک مردم خیز قصبہ ہے۔انہوں نے اپنے بڑے بھائی مولوی عنایت رسول اور مولانا محمد یوسف فرنگی محل اور مولوی نعمت اللہ صاحب فرنگی محل سے تمام علوم وفنون کی تکمیل کی تھی ۔علم وادب اگر چہ خود حاصل کیا تھا تاہم بہت بڑے ادیب اور ناظم وناثر تھے۔علمی ذوق اس قدر غالب تھا کہ سخت سے سخت دنیاوی کشمکشوں میں بھی تعلیم کا سلسلہ منقطع نہیں ہوتا تھا...... تمام مسائل علمیہ میں مجتہدانہ رائے رکھتے تھے۔جب کوئی کتاب پڑھاتے تھے تو عموما مصنف کی غلطیوں اور فروگزاشتوں سے تعرض کرتے تھے۔میں نے معقولات کی تمام کتابیں مثلا میر زاہد، ملا جلال مع میر زاہد، حمداللہ، شرح مطالعہ، صدرا، شمس بازغہ انہیں سے پڑھیں اور میری تمام تر کائنات انہیں کے افادات ہیں۔فارسی کا مذاق بھی انہیں کا فیض ہے......'' [۳]

یہ درست ہے کہ مولانا فاروق چریا کوٹی نے شبلی کی شخصیت کو نکھارنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اوران کے غنچہ ہائے علم وادب کو اسی بادنسیم کی مس نے شگفتہ کیا۔لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ اس موج نسیم کو بھی شبلی کی شگفتہ قلمی سے بوئے شہرت نصیب ہوئی۔مولانا فاروق کے قرض تدریس کو شبلی نے بدر جہا بہتر طریقے سے ادا کیا اور آج ان کی بدولت دنیائے ادب مولانا فاروق چریا کوٹی سے روشناش ہوئی۔یہ معاملہ بالکل وہی ہے جو اقبال اوران کے استاد میر حسن کا تھا۔میر حسن نے اگر چہ اقبال کا اقبال بلند کیا تو میر حسن کو بھی اقبال کی بدولت شمس العلماء کا خطاب عطا ہوا۔مولانا فاروق کے علاوہ بھی بہت سے علماء ادب چریا کوٹ میں پیدا ہوئے ۔اس چھوٹے سے قصبے پر قدرت نہایت مہربان وفیاض نظر آتی ہے۔ ایک درجن سے زائد اہل کمال اس سرزمین نے پیدا کئے ۔لوگوں میں ذوق ادب بالیدہ ہے۔اور آج بھی بزمی چریا کوٹی اور جامی چریا کوٹی کے نغموں سے فضا مترنم ہے۔

مولانا اسلم جیراج پوری

اعظم گڑھ کی اس زرخیز مٹی سے پیدا ہونے والا ایک اہم نام مولانا اسلم جیراج پوری کا ہے جنہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ تصنیف وتالیف میں گزارا، اور مختلف النوع موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے۔تخلیقی ثبوت کے طور پر تقریبا دو درجن کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔آپ نے فارسی شعراء کو بالخصوص اپنے قلم کا موضوع بنایا ہے۔''حیات حافظ''اور''حیات جامی''اس کا بہترین نمونہ ہیں۔خصوصاً ''حیات حافظ'' ان کے تنقیدی شعور کا شاہکار ہے۔آپ نے جس طرح ایک ایک شعر میں کئی کئی صنعتیں دریافت کی ہیں اور موقع بہ موقع فارسی عربی اور اردو اشعار سے موازنہ کیا ہے اس سے آپ کی شعر فہمی اور علم بیان پر گہری نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس حقیقت سے بہت کم لوگ آگاہ ہیں کہ آپ شاعر بھی تھے۔لیکن کم کہتے تھے اور غالبا کوئی مجموعۂ کلام نہیں چھوڑا۔آپ کی شاعرانہ حیثیت کا ندازہ لگانے کے لئے آپ کی ایک فارسی نظم کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔جو آپ نے اپنے والد کے مزار کے قریب پھیلی ہوئی گندگی دیکھ کر کہی تھی اور از راہ شکایت بیگم بھوپال کو بھیجی تھی۔

حضرت نواب سلطان جہاں گردوں وقار
آنکہ باصد شوکت وحشمت جہاں بانی کند

بندہ بر درگاہ تو ایک التماس آوردہ ام
از لطف نگاہ خویش ارزانی کند

تکیۂ شاہ محبت آنکہ مدفن گاہ اوست
بندہ را از رشتۂ جان جذب پنہانی کند

اندر آں تکیہ کہ بروئے رحمت بسیار باد
حالتے دیدم کہ پیدا رنج پنہانی کند

از غلاظتہا کہ نااہلاں در آں تکیہ کند

دل نمی خواہد کہ آنجا فاتحہ خوانی کند

چشم میدارم کہ سرکار از رہ لطف عمیم

انسداد ایں چنیں افعال شیطانی کند

آفتاب دولت و اقبال تو تابندہ باد

خطۂ بھوپال را عدل تو نورانی کند

آپ کی کچھ تصانیف درج ذیل ہیں:

تاریخ القرآن ،حیات حافظ ،حیات جامی،الوراثۃ فی الاسلام،(عربی زبان میں)،تاریخ الامت (سات حصوں میں)،تاریخ نجد،عقائد اسلام اور ارکان اسلام وغیرہ۔

اقبال سہیل

خطۂ اعظم گڑھ کا یہ المیہ رہا ہے کہ یہاں کے لوگوں نے اپنی کان میں پیدا شدہ سیم وزر کی قدر دانی میں ہمیشہ کنجوسی سے کام لیا ہے۔لیکن یہ بے اعتنائی اور عدم نوازش اقبال سہیل کے ساتھ افسوس ناک حد تک روا رکھی گئی۔علامہ اقبال سہیل کا شماران شعراء میں ہوتا ہے جن کے علم ودانش سے سارا بر صغیر روشن ہوا۔حالانکہ ان کے اندر نرگسیت بالکل نہ تھی۔لیکن انہوں نے مزاج ہی کچھ ایسا لاابالی اور مست و بے پرواہ قسم کا پایا تھا کہ شہرت کی بو باس ان میں نہ تھی۔وہ تو اپنے حال سے غافل تھے بھلا مستقبل کی فکر کیا کرتے۔لیکن افسوس ہے کہ ان کے خوشہ چیں حضرات نے بھی ان کو نظر انداز کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔اعظم گڑھ کی اس سے بڑی بدنصیبی اور کیا ہوسکتی ہے کہ اتنے عظیم المرتبت ادیب وشاعر کے نام سے نہ ہی کوئی یادگار قائم کی گئی ،نہ ہی کسی درسگاہ وانجمن کی بنیاد ڈالی گئی۔اور نہ اس بات کی کوشش کی گئی کہ کم از کم اتر پردیش کی حد تک اسکول اور کالجوں میں ان کا کلام شامل نصاب کیا جائے۔اور تو اور اعظم گڑھ کے اردو اساتذہ کو بھی اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ غیر درسی طور پر ہی سہی طلباء کو اقبال سہیل کی شاعری کے خدوخال سے آگاہ کروایا جائے۔البتہ جناب افتخار اعظمی نے اپنی ذاتی دلچسپیوں اور کوششوں سے اقبال سہیل کے دو مجموعے’’ارمغان حرم‘‘اور’’تابش سہیل‘‘ شائع کیے۔

اقبال سہیل کی شخصیت اور فن کے مطالعہ سے یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کو یہ ساری صلاحیتیں ودیعت کی گئی تھیں۔عربی، فارسی اور اردو زبان میں انہیں یکساں عبور حاصل تھا۔شاعرانہ مہارت، نظم ونثر دونوں میدانوں کا بادشاہ، منطق وفلسفہ پر گہری نظر، مذہب وتصوف کا محرم راز، قانون کا ماہر، غرض کہ کوئی بھی موضوع چھیڑ دیجئے پھر بحث کا منظر دیکھئے۔بقول رشید احمد صدیقی:

''چار برس کالج میں رہے، بورڈر تھے لیکن تمام زمانہ دوسروں کے کمروں پر گزارا۔دن کا کیا ذکر، رات ہوئی جس کمرے میں ہوتے وہیں رات گزار دیتے۔ کمرے والے کو شعر سناتے رہتے یا اس کو اقتصادیات، فلسفہ، تاریخ، الٰہیات، فارسی وعربی یا شعر وشاعری پر لیکچر دیتے ورنہ پھر آم، پان، زمینداری، مذہب، عورتوں کی اقسام، مردوں کے امراض، مسلمانوں کے انجام پر خطبہ دیتے۔زائد چارپائی کا انتظام ہوا تو خیر ورنہ کسی کے ساتھ اسی کی چارپائی پر شکن بستر ہو جاتے۔جس بحث کو اٹھاتے معلوم ہوتا:

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں ؎

اقبال سہیل کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ شعور کی نہیں، تحت الشعور کی دین ہے۔یہ صحیح ہے کہ شعر کا تعلق شعور سے ہے۔شاعر کوئی مجذوب یا دیوانہ نہیں ہوتا۔لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ تخیل کی شدت آمد اکثر اوقات الہام کی حد سے جا ٹکراتی ہے۔اس وقت شاعر ضرور مجذوب ہوتا ہے ہاں اتنا ضرور ہے کہ مضمون کو تکنیکی صورت دینے کے لئے کبھی کبھی کسی شاعر کو نہایت کرب انگیز صورتحال سے گزرنا پڑتا ہے۔ایسا نہیں ہے کہ شعوری طور پر عمدہ بندش اور مؤثر الفاظ کے انتخاب میں شاعر شاعری کی دیوار سے سر ٹکراتا ہے بلکہ شاعر کا وجدان اپنی فکر کے معیار کے شایان شان الفاظ خود پیدا کر لیتا ہے ۔اس کے لئے لغت سے الفاظ کے انتخاب کا میکانکی عمل کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔یہی بات اقبال سہیل کی شاعری سے ظاہر ہوتی ہے۔نہایت قادر الکلام شاعر تھے۔یہ عجیب بات ہے کہ شاعر کا تخیل جس قدر قوی ہوگا وہ اتنا ہی قادر الکلام ہوگا۔یہ الفاظ دیگر شاعر تخیل کو گرفت میں نہیں لیتا بلکہ تخیل خود شاعر کو اپنی گرفت

میں لے لیتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ نظمیں یا غزلیں جوانہوں نے فی البدیہہ کہی تھیں ان کو اپنا نام نہ دیا ۔رشید احمد صدیقی جیسے ادیب کے اصرار پر کہ ان کو ''علی گڑھ منتھلی'' میں شائع کر دیا جائے تو فرمایا کہ ایسی ویسی نظموں کو کون اپنے آپ سے منسوب کرے۔رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

''......مجھے اکثر ایسا محسوس ہوا کہ مولانا کے فارسی کلام میں اردو سے زیادہ طرفگی اور تازگی ہے......کہانہیں جاسکتا کہ مولانا فارسی نظمیں جلد لکھ سکتے تھے یا اردو۔کچھ بھی ہو لکھتے بہت جلد تھے۔اتنا جلد کہ تصور میں بھی بہ مشکل آسکتا ہے۔'' ۵؎

اقبال سہیل کے ساتھ مضمون و بندش نے کبھی بے وفائی نہیں کی۔فی البدیہہ نظم ونثر لکھتے تھے،گویا ہمہ وقت آمد کی کیفیت میں ڈوبے رہتے تھے جس کی مثال رشید احمد صدیقی نے کچھ اس طرح پیش کی ہے:

''۱۹۱۸ء یا ۱۹۱۹ء کا واقعہ ہے یونین میں ام الالسنہ عربی پر خواجہ کمال الدین مرحوم کی اردو میں تقریر تھی۔مرحوم نے بڑی قابلیت اوراعتماد کے ساتھ تقریر کی۔مولانا سہیل کی آنکھوں میں تکلیف تھی،سردیوں کا زمانہ تھا،مولانا کو احباب اسپتال سے لائے تھے۔یونین میں مجمع دیکھا تو کہا مولانا تکلیف نہ ہوتو ذرا تقریر سننے چلی۔مولانا نے کہا اچھی بات ہے،لیکن آنکھوں میں تکلیف زیادہ ہے جلد اٹھ آئیں گے۔خواجہ صاحب نے کم وبیش دو گھنٹے تقریر کی۔حاضرین محو حیرت تھے۔تقریر ختم ہوئی تو وائس پریسیڈنٹ نے اعلان کیا کہ مولانا سہیل فاضل مقرر کا طلبائے کالج کی طرف سے شکریہ ادا کریں گے۔مولانا نے بے تکلف تقریر شروع کردی۔اس اعتماد سے گویا تمام عمر اسی مبحث پر تیاری کی تھی......پون گھنٹے تک تقریر کی،نئے نئے پہلو سے موضوع پر روشنی ڈالی،نئی نئی مثالیں پیش کیں۔تقریر کو اس درجہ دلنشیں اور کہیں کہیں اتنا شگفتہ بنادیا کہ خواجہ صاحب نے بے اختیار ہوکر گلے لگالیا اور فرمایا،تمہارے ایسا جامع کمالات ساتھ کام کرنے والا مل جائے تو میں اسلام کا جھنڈا یورپ کی سب سے بلند چوٹی پر نصب کردوں۔'' ۶؎

اقبال سہیل میں پرگوئی اور فی البدیہ کہنے کی صلاحیت ایسی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی کہ احساس ہوتا ہے کہ تحریر سے زیادہ آمد کی رفتار تھی ۔ جب کوئی مضمون لکھنے کی فرمائش کی جاتی تو کہتے ،آ! قلم کاغذ اٹھاؤ اور لکھو اور یہ عالم ہوتا گویا کوئی مافوق الفطرت ہستی ان پر مسلط ہوگئی ہے ۔اور ان کی زبان کو اپنی مرضی سے استعمال کر رہی ہے۔ بقول رشید احمد صدیقی:

''تین تین گھنٹے تک مسلسل لکھواتے رہتے'' ۷

مرزا احسان بیگ نے ان کے فن پر اس طرح سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''وہ تمام قابلیت جو کامل الفن مصنف کے لئے ضروری ہے ان میں موجود تھی۔ وہ فطرتاً فلسفی تھے۔ طبیعت میں جدت و اجتہاد کا مادہ بھی تھا نظر تنقیدی اور محققانہ پائی تھی۔ حافظہ عجیب و غریب تھا...... ہر موضوع پر خواہ اس کا تعلق مذہب و سیاست سے ہو یا علم و ادب سے ان کی ہمہ گیر طبیعت یکساں حاوی تھی......ان گوناگوں اوصاف کے ساتھ ایک سحر طراز قلم بھی ان کے ہاتھ میں تھا جس کی ادیبانہ طرز نگارش دیکھ کر شعر العجم مصنف کی یاد تازہ ہو جاتی تھی'' ۸

شاہ معین الدین ندویؒ نے اقبال سہیل کی خصوصیات کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''......اقبال سہیل صاحب اور ان کے کلام سے صاحب ذوق طبقہ پوری طرح واقف ہے۔ وہ بڑے لائق، ذہین، طباع اور خوش گفتار تھے۔ ان کی گفتگو علم و ادب، لطائف و ظرائف کا زعفران زار ہوتی تھی۔ جب بھی آجاتے تھے تو لطف و لطائف کا ایک گلستاں کھل جاتا تھا''۔ ۹

رشید احمد صدیقی نے ان کی حاضر جوابی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

''......میں گھر میں تھا سہیل صاحب کی اطلاع ہوئی تو بے اختیار باہر آیا اور بہت سے غیر ذمہ دارانہ فقرے کچھ ادھورے کچھ پورے ورد زبان کرتا آیا۔ اس لئے کہ میں نے سہیل صاحب جیسا بے پناہ برجستہ گو اور دقیقہ سنج اب تک نہیں دیکھا۔ وہ عالمانہ نکتوں

اور مجلسی فقروں کو اس لطف کے ساتھ ایک دوسرے میں سموئے ہوئے برمحل مسلسل چست کرتے چلے جاتے ہیں کہ طبیعت عش عش کر جاتی ہے۔'' ۱۰

اقبال سہیل کی زود گوئی کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی شخص اپنے کلام پر اصلاح کی غرض سے آپ کے پاس آتا تو اس کے نام سے خود اشعار لکھ کر دے دیتے تھے۔ اور اگر سوال کیا جاتا کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ اصلاح کیوں نہیں دیتے تو جواب ملتا کہ جب تک اصلاح کروں اس سے کم وقت میں غزل ہی کیوں نہ لکھ کر دے دوں۔ ظاہر کہ اس طرح کے واقعات حضرت سہیل کی قادر الکلامی اور برجستہ گوئی کے اعلیٰ نمونے تو کہے جا سکتے ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ طرز ادب کے لئے کوئی نیک شگون نہیں ہے۔ کیونکہ اس طرح سے جس شاعر کو کلام لکھ کر دیا جائے گا اس کی صلاحیتیں ختم ہو کر رہ جائیں گی۔ اس کی فکر کے سوتے خشک ہو جائیں گے اور نئی شاعری کے امکانات موہوم ہو جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال سہیل کے اس طرز عمل پر رشید احمد صدیقی گرفت کرتے ہیں:

''بہت سے مسلم الثبوت شعراء (ہمارے محترم مولانا سہیل صاحب معاف فرمائیں) دوسروں کے کلام پر اصلاح نہیں دے سکتے بلکہ شاگردوں کا تقریباً سارا کلام کاٹ کر اسی زمین میں اپنا کلام حوالہ کر دیتے ہیں۔ اس طریقہ کار سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ شعر و شاعری میں اختراع و جدت کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ دوسرے شعر و شاعری خود فرسودہ ہو جاتی ہے۔ اور بعض ہونہار طبیعتیں یا غلط راستے پر لگ جاتی ہیں یا بالکل بجھ جاتی ہیں۔'' ۱۱

اقبال سہیل نہ صرف ایک بلند پایہ شاعر ہی تھے بلکہ دیگر فنون لطیفہ پر بھی ان کی نظر گہری تھی۔ حالانکہ ہر فن لطیف کی اہمیت اپنی اپنی جگہ مسلم ہے۔ لیکن ان میں باریک نکات کا جو فرق ہے اس پر اقبال سہیل نے نہایت عالمانہ نظر ڈالی ہے، فرماتے ہیں:

''ایک بت تراش کی تخیل ابعاد ثلاثہ کے حدود سے متجاوز نہیں ہو سکتی۔ مگر ایک شاعر کا تخیل عالم قدوس تک پرواز کرتا ہے......ایک مغنی اپنے ترانۂ جاں نواز سے صرف

روح میں انبساط پیدا کرسکتا ہے۔مگر ایک شاعر اپنے ترنم کے نفس ناطقہ پر بھی عالم حال طاری کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔''۱۲؎

اس کے بعد اقبال سہیل نے شاعری کے چار عناصر بتائے ہیں (۱) موسیقی (۲) بت تراش یا ایجاد و تخلیق (۳) مصوری (۴) اسرار و معارف۔ان میں آخر الذکر کے علاوہ تینوں عناصر شاعری اور دیگر فنون لطیفہ میں کسی حد تک مشترک ہیں لیکن اسرار و معارف وہ منزل ہے جہاں شاعری کے علاوہ دیگر فنون لطیفہ کی رسائی ناممکن ہے۔اس سلسلے میں اقبال سہیل فرماتے ہیں:

''......اس (اسرار و معارف) سدرۃ المنتہی کے آگے اسرار حکمیہ اور معارف السہیہ کی بزم تجلی شروع ہو جاتی ہے۔جہاں صرف شاعر کے تخیل کو باریابی کا موقع مل سکتا ہے اور یہی مقام شاعری کی معراج ہے۔اگر ایک شاعر عالم رنگ و بو سے گزر کر فلسفہ و حکمت کے نکتہ ہائے سر بستہ مذہب کے اسرار و رموز اور مراحل سلوک عرفان کی کیفیات مجردہ اسی مترنم،اسی جدت بیان اور حسن مصوری کے ساتھ ادا کرتا ہے تو اس کی شاعری سحر سے گزر کر اعجاز بن جاتی ہے......''۱۳؎

اقبال سہیل کی ہمہ پہلو شخصیت اور نیرنگی فکر و فن اپنے قدردانوں سے بہت کچھ لکھنے کا تقاضہ کرتی ہے۔لیکن محدود وقت اور وسائل کا جبر قلم انداز کرنے پر مجبور کرتا ہے۔مذکورہ بالا اقتباسات نثر کے ساتھ ذیل میں ان کا کلام بھی درج کیا جاتا ہے۔تا کہ ان کی شاعرانہ عظمت بھی نمایاں ہو سکے۔

ننگ ہے بے عمل قبول بہشت
یہ تو صدقہ ہوا صلہ نہ ہوا

عشق اور حسن سے سوال کرم
یہ تو غیرت کا اقتضا نہ ہوا

دل خطا وار اشتیاق سہی
لب گنہگار التجا نہ ہوا

نوک خامہ سے کھول دوں گا سہیل
باب فردوس گر کھلا نہ ہوا

رقصاں سر شہید کہ پائی حیات نو
تیغ ستم کو ناز کہ بسمل نہیں رہا

مجھ سے پوچھو نہ مزاج دلِ ناشاد ابھی
میرے نغموں میں ہے کچھ تلخیِ فریاد ابھی

بجلیاں آئیں جو باہر سے وہ رخصت بھی ہوئیں
شعلہ افگن ہے مگر برق چمن زاد ابھی

نخوت حسن کے ماتھے پہ شکن دوڑ گئیں
عشق نے وا نہ کئے تھے لب فریاد ابھی

مولانا فاروق چریا کوٹی

مولانا فاروق چریا کوٹی کے فرزند مولانا کیفی چریا کوٹی کو بلا مبالغہ علم وادب کا سمندر کہا جا سکتا ہے۔قدرت نے والد کی ساری صلاحیتیں آپ کے سینے میں منتقل کر دیں تھیں۔آپ ۱۸۹۰ءکو اعظم گڑھ کے مشہور علمی وادبی قصبے چریا کوٹ میں پیدا ہوئے۔عربی وفارسی زبانوں میں ید طولیٰ حاصل تھا ہی اردو اور ہندی میں آپ کی قابلیت مسلم تھی۔مولانا عنایت رسول چریا کوٹی سے جو آپ کے چچا تھے ترکی ،عبرانی اور سریانی زبانیں سیکھیں۔فرنچ اور لاطینی زبانوں میں بھی آپ کی استعداد اچھی تھی۔اپنے والد سے آپ نے فلسفہ،منطق، فقہ،حدیث اور ریاضی کی تعلیم حاصل کی ۔آپ نے یونیورسٹی لائبریری علی گڑھ میں عربی ،فارسی اور بہت سے مشرقی علوم کی فہرست تیار کی۔آپ نے ہندستانی اکیڈمی الہٰ آباد کے لئے جواہر سخن کے نام سے اردو شاعری کا ایک انتخاب مرتب کیا جو سات جلدوں پر مشتمل تھا۔آپ نے اپنے وطن سے ایک رسالہ ''العلم'' جاری کیا تھا۔آپ ''انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' علی گڑھ،''سبحان'' گورکھپور، روزنامہ ''زمانہ''

کلکتہ، روز نامہ ''انقلاب زمانہ'' کے ایڈیٹر بھی رہے۔ آپ کی ایک غزل پیش کی جاتی ہے:

ہے سحر قریب مگر نہیں یہ تصورات نیاز میں
میری رات جا کے الجھ گئی خم و پیچ زلف دراز میں
میرے سامنے سے گزر گئی میری عمر اور خبر نہیں
وہ جبیں کے پیچ میں آ گئے تھے دم سجود نماز میں
میرا عشق اصل نیاز ہے تجھے اپنے حسن پہ ناز ہے
میری بندگی ہے تمام گم تیرے لطف بندہ نواز میں
میں جنون عشق میں چل پڑا یہ نصیبِ دل یہ نصیبِ جاں
یہی کل حقیقتِ خلد ہے کہ ملے وہ راہ حجاز میں
شب اشک کیفیِ غم سکوں یہ سحر کرے تو سحر کروں
یہی رات میری وہ رات ہے جو پڑی ہے دل کے گداز میں

مرزا احسان بیگ

اعظم گڑھ میں انور اعظمی سے پہلے شعراء کی فہرست میں ایک اہم نام مرزا احسان بیگ کا بھی ہے۔ آپ ایک کامیاب وکیل تھے، شعر و شاعری کا مذاق فطری تھا۔ آپ ۱۸۹۵ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے دم سے شہر میں شعری محفلوں کا بازار گرم رہتا تھا۔ وکالت کی خشک فضا بھی ان کی شاعری کے سوتوں کو خشک نہ کر سکی وہ شاعری میں وکالت کو داخل ہونے سے روکتے رہے ہاں ان کی وکالت میں شاعری در آئی وہ شعری محفلوں میں صرف شاعر تھے لیکن عدالت میں وکیل بھی تھے اور شاعر بھی انھوں نے نہ صرف خود شعر و سخن کی سر پرستی کی بلکہ دوسروں کو بھی ان کا مستحقہ مقام دلانے میں پیش پیش رہے۔ جس زمانے میں جگر مراد آبادی چشموں کا کاروبار کرتے تھے اس وقت جگر کو بہ حیثیت شاعر صرف جگر کے حلقوں کے لوگ ہی جانتے تھے یہ مرزا احسان بیگ ہی تھے جنہوں نے اردو کو جگر سے متعارف کروایا۔ جگر مراد آبادی چشموں کی تجارت کی غرض سے اعظم گڑھ آیا کرتے تھے۔ لیکن یہاں کی ادبی محفلوں میں شرکت کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے مرزا احسان بیگ شہر میں کسی کام سے فراغت کے بعد

واپس ہورہے تھے۔اس وقت شنکرمورتی سہ راہے پرایک شراب خانہ تھا۔وہاں ایک خستہ حال شخص نشے میں چورنہایت شیریں آواز میں کچھ گنگنارہا تھا۔احسان صاحب چونکہ خود شاعر تھے اور کچھ اس مترنم آواز نے بھی دامن دل کھینچا،اس شخص کے قریب گئے اور پوچھا کہ تم شاعر ہو۔اس شخص نے جواب دیا معمولی سا لگاؤ ہے۔کچھ کہہ لیتا ہوں۔گفت وشنید سے معلوم ہوا کہ موصوف جگر مرادآبادی تھے۔ایک نشست میں شرکت کے لئے جگر کو ایک مصرعہ طرح دیا گیا اور وقت پر آنے کی دعوت دی گئی۔جب جگر مقررہ وقت پر حاضر ہوئے تو انہوں نے ازراہ معذرت کہا کہ مصرعہ طرح گم ہو گیا تھا۔انہوں نے مصرع حاصل کیا اور آدھے گھنٹے کے اندر غزل کہہ دی۔اس کے بعد جگر اعظم گڑھ کے جگر بن گئے۔شہر کے شائقین ادب نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔جگر صاحب کا پہلا مجموعہ کلام ''داغ جگر'' مرزا احسان بیگ ہی نے اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

مرزا احسان بیگ نے ہندوستان کے نامور شعراء کے کلام پر تنقیدیں کی ہیں۔ان تنقیدوں کے آئینے میں وہ شعر کے شارح سے زیادہ شعر کے فلسفی کی شکل میں جلوہ گر نظر آئے ہیں۔ان کی تنقیدوں کا رنگ زیادہ تر تاثراتی اور جمالیاتی ہے لیکن انہوں نے شعر کا لطف لینے کے ساتھ توازن بھی برقرار رکھا ہے۔وہ آہ اور واہ میں اس قدر نہیں کھوئے کہ مقصدِ تنقید سے غافل ہو جائیں۔ہاں اتنا ضرور ہے کہ وہ خود شاعر تھے۔لہٰذا شعر کی فنی باریکیوں پر ان کی نظر زیادہ ہوتی تھی۔لیکن ایسا نہیں ہے کہ شعر میں مقصدیت کی اہمیت کے قائل نہیں۔ہر تنقید نگار اپنے نقطۂ نظر سے فن پارے کو پرکھتا ہے۔لہٰذا خوبصورت شعر کی کیفیت میں ڈوب کر بے ساختہ وجد میں آنا کوئی خلاف فطرت عمل نہیں ہے۔اگر شعر کا لہجہ وجد انگیز ہے تو زبان سے آہ یا واہ نکل جانا فطری ہے۔احسان صاحب کی تنقیدوں نے قاری کے ساتھ اتنا احسان ضرور کیا کہ اشعار کی کمیت و کیفیت کے ساتھ شرح کی اور قاری کو اس مقام تک پہنچانے کی حتی الامکان بلکہ کامیاب کوشش کی جو شاعر کا مقصد تھا۔تخلیق عمل کے وقت شاعر کس کرب یا کیفیت سے دوچار تھا۔قاری اس کا بھی بہ اعتبار ظرف وصلاحیت ان کی تنقیدوں کے وسیلے سے ادراک کرسکتا ہے۔

شعر اور فلسفہ پر بحث کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ شاعر کو قدم قدم پر احساس ہونا چاہئے کہ وہ شاعر ہے فلسفی نہیں۔ان کے خیال میں شاعر کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مذہب وفلسفہ سے لے کر سیاست

ومعاشرت تک ہر موضوع پر قلم اٹھا سکتا ہے۔لیکن روح شعری پر ضرب نہیں لگنی چاہئے۔ورنہ وہ خالص مولوی اور فلسفی بن کر رہ جائے گا۔اصغر گونڈوی کا شعر ہے:

مقام جہل کو پایا نہ علم وعرفاں نے
میں بے خبر ہوں بہ انداز فریب شہود

اس شعر پر یوں تبصرہ فرماتے ہیں:

''غور کرو کہ یہ کس قدر دقیق فلسفیانہ نکتہ ہے۔جس میں شعریت پیدا کرنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ چنانچہ جہاں تک پہلے مصرع کا تعلق ہے انداز بیان خالص فلسفیانہ ہے ۔اگر مصرعہ ثانی کا بھی یہی رنگ ہوتا تو وہ کسی تصوف وحکمت کی کتاب کی کوئی سطر زریں ضرور بن جاتا۔لیکن شعر کہلائے جانے کا مستحق نہ ہوتا۔لیکن غور کرو'' بہ انداز فریب شہود'' کے ٹکڑے نے انداز بیان میں کس قدر شعریت پیدا کردی۔ چنانچہ یہ ٹکڑا اگر موجود نہ ہوتا تو مصنوعی لحاظ سے اس شعر میں کوئی خاص لطافت اور بلندی پیدا نہ ہوتی''۔[۱۴]

ایک عام خیال ہے کہ شعر میں حسن سادگی سے پیدا ہوتا ہے۔فارسیت کا غلبہ شعر کی لطافت پر بار ہے۔مرزا احسان بیگ اصغر گونڈوی کے شعر کے حوالے سے بڑا عالمانہ تبصرہ کرتے ہیں:

''حضرت اصغر کے حسن ادا کا خاص راز ان کا ذوق فارسیت ہے ۔غزل کی زبان اگر چہ جہاں تک ممکن ہو سادہ،شیریں،اور تکلف سے پاک ہونی چاہئے۔تاہم ایک لطیف طبع شاعر فارسی ترکیبوں کی نزاکت کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔لیکن اس موقع پر اس کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ جو فارسی ترکیبیں استعمال کی جائیں وہ شاعرانہ رنگینی اور نزاکت سے خالی نہ ہوں ۔ورنہ کلام میں ثقالت اور پستی آجائے گی ۔حضرت اصغر فارسی ترکیبوں کے خاص طور پر دلدادہ ہیں لیکن چونکہ نکتہ سنج ہیں اس لئے ایسی لطیف ترکیبیں استعمال کرتے ہیں جن سے شعر میں ایک خاص دلکشی ورعنائی پیدا ہوجاتی ہے۔مثلاً

جو مجھ پہ گزری ہے شب بھر وہ دیکھ لے ہمدم

چمک رہا ہے شرہ پر ستارۂ سحری

ستارۂ سحری سے قطرۂ اشک کی تشبیہ کس قدر لطافت میں ڈوبی ہوئی ہے'' ۱۵

آپ کا مجموعہ کلام ۱۹۴۰ء میں ''پیام کیف'' کے نام سے شائع ہوا۔ اور ادبی تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''مقالات احسان'' کے نام سے ۱۹۶۸ء میں پس مرگ شائع ہوا۔ ۱۶

اس لحاظ سے ۱۹۶۸ء سے قبل آپ کا انتقال ہو چکا تھا۔ لیکن مالک رام نے ان کی تاریخ وفات ۲۲/دسمبر ۱۹۷۲ء بیان کی ہے۔ ۱۷

مرزا احسان بیگ کا رنگ تغزل ملاحظہ فرمائیں:

ولولۂ جنون غم ان کو ذرا دکھائے جا
کھا کے دل و جگر پہ چوٹ ہجر میں مسکرائے جا

جلوۂ لطف خاص سے میری نظر ہے آشنا
میں ہمہ تن نیاز ہوں برق ستم گرائے جا

حسن ستم طراز کی مصلحتوں کا کیا پتہ
اس کی ہر ایک ادا پہ تو دیدۂ سر جھکائے جا

اس سے زیادہ اور کیا حاصل ذوق عاشقی
درد سے لذتیں اٹھا جوش طلب بڑھائے جا

رفعت مہر وماہ کیا اوج حریم خلد کیا
سب ہیں تیری یہ گرد راہ گام طلب اٹھائے جا

اکمل اعظمی

سرزمین اعظم گڑھ کے جن استاد شعراء نے بڑی خاموشی اور عزلت نشینی کے ساتھ اردو شاعری

کی بے لوث و بے غرض خدمات انجام دیں۔ان میں اکمل اعظمی کا نام فراموش نہیں کیا جاسکتا۔آپ ۱۹۰۱ء میں اعظم گڑھ کے معروف گاؤں موضع اساڑھا میں پیدا ہوئے۔مدرسۃ الاصلاح سے تعلیم حاصل کی۔تقریباً بارہ چودہ برس کی عمر میں رنگون چلے گئے۔اس زمانے میں بھی جو آپ کی شاعری کا ابتدائی دور تھا آپ کی غزلوں میں جوش کی بجائے ہوش اور غمِ جاناں کی جگہ غمِ دوراں کا پرتو نظر آتا ہے۔کسب معاش کی ضرب کے ساتھ ساتھ فرقت وطن نے بھی کاشانۂ قلب وجگر میں زخموں کے بیل بوٹے کھلائے۔جس کا فطری نتیجہ یہ ہوا کہ غزلوں میں زخمی غزال کی سی آہ جگر دوز موجود ہے۔۱۹۴۵ء میں آپ وطن واپس ہوئے۔دوسری جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی۔لیکن اس کا صدمہ اور تھکن ابھی باقی تھی کہ تقسیم کا المیہ پیش ہوا۔اور پھر ملک کی خوشگوار فضا بتدریج فرقہ واریت کے زہر سے مسموم ہوتی گئی۔۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی ہندو پاک جنگ نے جینے کی رہی سہی سکت بھی چھین لی۔غرض کہ ہر لحاظ سے عرصہ حیات تنگ ہونے لگا۔اور زندگی کے وسائل ایک ایک کر کے ساتھ چھوڑنے لگے تو یہ عندلیب ادب چشم غزل کو اشکبار چھوڑ کر سوئے باغ عدم پرواز کر گیا۔

آپ کی غیر مطبوعہ خود نوشت کے مطابق آپ کی شاعری تین ادوار پر مشتمل ہے۔از ابتداء تا ۱۹۳۰ء،اس دور کا سارا کلام آپ نے اپنے ایک عزیز شاگرد کو بخش دیا۔۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۵ء تک شعری سرمایہ ایک عزیز کے ہاتھوں ضائع ہو گیا۔جس کا قلق انہیں انہیں کے لفظوں میں تادمِ زیست رہے گا۔۱۹۴۵ء سے ۱۹۷۵ء (سال وفات) تک کا کلام آپ کے فرزند رشید اثر اعظمی کے پاس جوان کے ادبی سرمائے کے وارث وامین بھی ہیں غیر مطبوعہ شکل میں موجود ہے۔آپ استادفن تھے۔اقبال سہیل کے فیضان کرم کے معترف تھے۔اپنے ادبی شعور کو علامہ شبلی کا عطیہ فیض تصور کرتے تھے۔چنانچہ ایک شعر میں خود کو خرمن شبلی کا خوشہ چیں قرار دیتے ہیں:

در جہان شاعری اکمل ز فیضان سہیل
خوشہ چیں خرمن شبلی نعمانی منم

کسی تبصرے کے بغیر آپ کی ایک غزل پیش ہے:

انہیں دیکھنا چاہے گا جہاں تک
نظر آئیں گے آپ کو وہ وہاں تک

تری بھی نہیں خیر اے برق سوزاں
اگر آنچ آئی میرے آشیاں تک

کہی خاکیوں سے فرشتوں نے سن لی
مری بات پہونچی کہاں سے کہاں تک

ہیں وہ باوفا ہم کہ راہ وفا میں
ضرورت ہو دل کی تو حاضر ہے جاں تک

یہی ہے میرا نعرۂ شاعرانہ
ہے لطف سخن صرف اردو زباں تک

قدم ڈگمگائیں نہ زنہار اکمل
ہے چلنا ابھی منزل امتحاں تک

یحییٰ اعظمی

اقبال سہیل کے صدف تربیت نے جن قطروں کو گہر بنایا۔ان میں سب سے تابناک شخصیت یحییٰ اعظمی کی ہے۔آپ ۱۹۰۶ء میں اعظم گڑھ کے مشہور قصبہ مہاراج گنج میں پیدا ہوئے۔نہایت بلند مرتبت شاعر تھے۔اور اعظم گڑھ کے قادرالکلام شاعر مولانا ضیاء اللہ کے صاحبزادے تھے۔مولانا ضیاء اللہ عربی و فارسی کے بہت اچھے عالم تھے۔فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔باپ کی علمی استعداد اور ادبی صلاحیت بیٹے کو بھی ودیعت ہوئی تھی،آپ کی تعلیم باقاعدہ طور پر نہ ہوسکی۔صرف اردو سے مڈل پاس کیا۔لیکن صلاحیت خداداد کے مالک تھے۔اپنی ذاتی لگن اور کوششوں سے آسمان ادب پر ایک روشن ستارے کی طرح چمکے۔غزلیں بھی اچھی کہتے تھے۔لیکن نظم کی طرف مزاج فطرتاً مائل تھا۔انہوں نے تقریباً تمام قومی رہنماؤں پر مرثیے کہے ہیں۔لیکن یہ مرثیے بین و ماتم کی فضا سے قطعا

آزاد ہیں۔اور جوش وولولہ کے ساتھ متانت وسنجیدگی کی خوبیوں سے مالا مال ہیں۔ان کی فکر بڑی بلند تھی۔عمیق سے عمیق مضمون کو بڑی فنکارانہ مہارت کے ساتھ پیرایۂ اظہار عطا کرنے پر قادر تھے۔ان کی نظمیں،مواد اور ہیئت دونوں کا شاہکار ہیں۔ڈاکٹر ذاکر حسین سابق صدر جمہوریۂ ہند آپ کے بڑے مداح تھے۔ذاکر صاحب کو احساس تھا کہ یحییٰ صاحب شہرت کی فصیلوں پر کمند ڈالنے سے بیزار واقع ہوئے ہیں۔ان کی غفلت سے اردو ادب ایک ہونہار شاعر سے محروم ہوجائے گا۔لہٰذا انہوں نے اپنی ذاتی دلچسپی سے آپ کے مجموعۂ کلام کو چھپنے کا حکم دیا۔ڈاکٹر ذاکر حسین رقم طراز ہیں:

''مجھے جناب یحییٰ اعظمی سے ایک مدت سے نیاز حاصل ہے۔ہمارے درمیان رابطۂ ذہنی وروحانی مرحوم اقبال احمد صاحب سہیل نے پیدا کیا۔مجھے طالب علمی کے زمانے میں سہیل کی رفاقت نصیب ہوئی۔ان کی قدرت کلام نے میرے دل پر گہرا اثر ڈالا۔اس قدرت کلام کی جھلک مجھے یحییٰ صاحب کے کلام میں دکھائی دیتی ہے۔مجھے تو ان کی بعض نظموں کو پڑھتے ہوئے ایسا گمان ہوتا ہے کہ میں سہیل کی نظم پڑھ رہا ہوں'' [۱۸]

ذاکر صاحب کا خیال مبنی بر حقیقت ہے۔ہر وہ شخص جسے ادب کا ذوق حاصل ہے اور جس نے سہیل اور یحییٰ دونوں کو پڑھا ہے اسے بار بار محسوس ہوگا کہ یحییٰ صاحب سہیل کے سچے پیرو ہیں۔اور ان کا ماہتاب کمال حضرت سہیل کے آفتاب جمال سے روشن ہے۔شاہ معین الدین ندوی فرماتے ہیں:

''وہ ان تلامیذ الرحمان میں ہیں جن میں شعر وسخن کا ملکہ فطری ہوتا ہے۔خوش قسمتی سے ان کو اقبال احمد خاں سہیل صاحب مرحوم جیسے استاد فن سے استفادہ کا موقع ملا ان کے فیض صحبت نے اس میں اور جلا دی۔اور ان کا کلام سہیل کے رنگ میں اتنا ڈوب گیا کہ بعض اوقات دونوں میں امتیاز مشکل ہوجاتا ہے۔'' [۱۹]

یحییٰ اعظمی کی شاعری پر بہت سے ارباب فکر ونظر نے تبصرے کئے ہیں۔سبھی نے ان کے کلام کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔گوشۂ گمنامی اور کنج خلوت میں زندگی گزارنے کے باوجود اس کامل فن پر اہل نظر کی نگاہیں پڑ ہی گئیں۔انہیں ناقدین فن میں ایک نام مالک رام کا ہے۔مالک رام کی ادبی حیثیت

ادب کے ایک معمولی طالب علم سے بھی مخفی نہیں۔ مالک رام کے تبصرے سے یحییٰ اعظمی کے شاعرانہ کمال پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔ فرماتے ہیں:

''یحییٰ اعظمی مرحوم شبلی اسکول کے شاعر تھے اور ان کے ذوق وشوق کی تربیت میں اقبال احمد سہیل کا بہت ہاتھ تھا۔ شبلی اور سہیل کا جتنا کامیاب اتباع انہوں نے کیا ہے وہ کسی سے نہ ہوسکا۔ ان کے دونوں مجموعے اس بات پر شاہد وعادل ہیں۔ انہوں نے رجال عصر سے متعلق جو نظمیں کہی ہیں اور ان میں کلام کا جو شکوہ ہے اس سے ان کی قدرت زبان، فارسی میں درک فن کی مہارت ایک ایک مصرعہ سے نمایاں ہے...... دیکھا جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ بنیادی طور پر یحییٰ غزل کے شاعر نہیں۔ ان کے جوہر نظم میں کھلتے ہیں۔ اور فارسی کی پرشکوہ ترکیبوں اور قدرت زبان کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا حق بہ جانب ہے کہ اگر انہیں قصیدہ یا رجزیہ لکھنے کی ضرورت پیش آتی تو اس میدان میں مشکل ہی سے کوئی ان کا حریف ثابت ہوسکتا تھا'' [۲۰]

یحییٰ اعظمی کی شاعری کے مولانا ابوالکلام آزاد بھی شیدا تھے۔ شاہ معین الدین ندوی کی طرح انہوں نے بھی یحییٰ اعظمی کو وہبی شاعر کہا ہے۔ یحییٰ اعظمی کی شاعری پر مولانا آزاد کا عالمانہ تبصرہ ملاحظہ ہو:

''کچھ لوگ شاعری کرتے ہیں اور کچھ لوگ شاعر ہوتے ہیں۔ صائب نے پہلی صنف کی نسبت کہا تھا شعر گفتن چہ ضرور اور بالکل صحیح کہا تھا۔ لیکن دوسری صنف کے لئے شعر گفتن نہ صرف ضروری ہی ہوتا ہے بلکہ ناگزیر ہوتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں میں یحییٰ اعظمی ہیں۔ ان کی طبیعت شاعرانہ واقع ہوئی ہے اس لئے جو کچھ کہتے ہیں مؤثر اور دلنشیں ہوتا ہے......'' [۲۱]

یحییٰ اعظمی نے خود اپنے ہی شعری مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''......میں جو کچھ کہتا ہوں اپنے احساس کی تسکین، روح کی تشفی، اور قلب کے انشراح وانبساط کے لئے کہتا ہوں۔ یہی وجہ ہے میرے آہنگ قلم اور میری نوائے فطرت میں

کوئی تضاد نہیں۔ دوسرے الفاظ میں جو میری زندگی ہے وہی میرا ادب ہے اور جو میرا ادب ہے وہی میری زندگی ہے''۔ ۲۲

اقبال سہیل سے اپنے رشتۂ تلمذ کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

''......ارباب نظر واقف ہیں کہ میرا ذوق و وجدان شبلی و سہیل سے متأثر ہے۔ اور مؤخر الذکر اور ناچیز کے درمیان تو آفتاب و ذرہ کا ربط رہا ہے اور بلا تامل عرض ہے کہ اس کے پاس جو کچھ بھی ہے سب اسی آفتاب دانش کی ضیا بخشی کا نتیجہ ہے:

شعاع فیض ہیں یہ نوازشیں ورنہ
کہاں یہ ذرہ کہاں مہر ضوفشاں سہیل'' ۲۳

یحییٰ اعظمی ایک عظیم شاعر ہی نہیں ایک بلند کردار انسان بھی تھے۔ قناعت و خودداری کا پیکر تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے باحیثیت اور متمول لوگوں سے اچھے مراسم کے باوجود کبھی دست طلب دراز نہیں کیا بلکہ ہر دستِ غیب کو پائے قناعت سے ٹھکرا دیا۔ چند احباب کی نوازش سے دارالمصنفین میں دفتر کے انچارج ہو گئے تھے۔ وہاں سے جو تنخواہ ہاتھ آتی تھی اسی پر گزر بسر تھی۔ نہایت تنگ دستی میں یہ پیکر وا یثار و وفا خدمت لوح و قلم میں تا حیات مصروف رہا۔ عمر کے آخری ایام میں عارضۂ جگر لاحق ہوا۔ بلڈ پریشر بھی بڑھ گیا تھا، زندگی نے بے اعتنائی برتنی شروع کر دی تھی۔ آخر میں پیشاب بھی بند ہو گیا تھا۔ انجام کار زندگی کی بے رخی پر موت کو رحم آ گیا۔ اور ۲۲ر فروری ۱۹۷۲ء کو گلشن شبلی کا یہ عندلیب خاموش ہو گیا۔

یحییٰ اعظمی کی ایک نظم پیش کی جاتی ہے جس کا عنوان ہے،'' علمائے سلف اور علمائے دور حاضر اور ہنگامۂ تکفیر''

ہلا دیتا تھا اک عالم کو شور لا تخف ان کا
قیامت تھا جہاد حق میں رہنا سر بکف ان کا
انہیں شایانِ شاں تھا وارث علم نبی کہنا
کہ تھا خلق حسن سرمایہ مجد و شرف ان کا

سبق دیتے تھے صلح وخیر کا افراد امت کو
ضیاء افگن تھا فیض علم وعرفاں ہر طرف ان کا
نوائے دعوت حق لے کے جس دم وہ نکلتے تھے
تو خود کرتا تھا باطل خیر مقدم صف بہ صف ان کا
قیامت ہے اگر اس دور میں اخلاف کے ہاتھوں
وہ نقد سیزدہ صد سالہ ہو جائے تلف ان کا
اب ان کی مسند ارشاد پر وہ لوگ بیٹھے ہیں
کہ ہر طرز عمل ہے باعث ننگ سلف ان کا
بزرگوں سے ملی تھی جو متاع بے بہا کھو دی
کہاں اب آہ وہ سرمایہ عز وشرف ان کا
وہی ہے ابر نیساں اب بھی مصروف گہر باری
مگر اب لولوے لالا سے ہے خالی صدف ان کا
فقط لے دے کے ہے اک مشغلہ تکفیر کا جاری
مسلمانوں کی جان ودین وایماں ہیں ہدف ان کا

امجد علی غزنوی

امجد علی غزنوی ضلع اعظم گڑھ کے ایک مشہور گاؤں محمد پور میں ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ امجد علی نام قرار پایا۔ آباء واجداد غزنی سے وارد ہندوستان ہوئے تھے اسی مناسبت سے خود کو امجد علی غزنوی لکھا۔ شاعری میں تخلص کی حیثیت سے بھی یہی نام برقرار رہا۔

امجد علی غزنوی کی تعلیم اعلیٰ پیمانے پر ہوئی۔ ابتدائی تعلیم جیسا کہ اس زمانہ کا دستور تھا گھر پر ہی ہوئی۔ اس کے بعد آپ نے شبلی ہائی اسکول اعظم گڑھ میں داخلہ لیا۔ دوران تعلیم آپ نے فارسی کے معتبر

عالم مولانا عزیز الرحمٰن فاروقی سے کسب فیض کیا۔اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے آپ گورکھپور تشریف لے گئے۔اور ۱۹۳۷ء میں بی-اے کی ڈگری حاصل کی۔گورکھپور کا زمانہ قیام امجد کے لئے نصابی تعلیم کے اعتبار سے ہی نہیں بلکہ ادبی ذوق کو نکھارنے میں بھی بڑا معاون ثابت ہوا، یہ زمانہ اردو ادب کی تاریخ کا روشن باب ہے۔رومانی اور روایتی ادب کے گلشن پر موسم خزاں کا تسلط ہو چکا تھا۔اور گلشن ادب میں ترقی پسند ادب کی کونپلیں پھوٹ رہی تھی۔اس زمانے میں جن لوگوں نے امجد کے شعری شعور اور ادبی ذوق کو نکھارنے میں نمایاں کردار نبھایا ان میں مجنوں گورگھپوری، مولانا سبحان اللہ، دیوانہ گورگھپوری اور ناطق بلگرامی کے نام نہایت اہم ہیں۔

بی،اے کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ نے ایل ایل بی کرنے کا ارادہ کیا۔لیکن والد صاحب کی ملازمت چھن جانے کی وجہ سے معاشی مسائل کھڑے ہوگئے تھے۔جب پنڈت نہرو کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے پنڈت مدن مالویہ جی کو جو اس وقت بنارس ہندو یونیورسٹی (بی،اچ،یو) کے سرپرست تھے ایک خط لکھا۔جس میں امجد کے والد کے ملک اور قوم پر احسانات کا حوالہ دیا۔مالویہ جی نے پنڈت نہرو کے خط کا سخت نوٹس لیا اور اپنی ذاتی دلچسپی سے امجد کا داخلہ ایل،ایل،بی میں کروایا۔اور تادم تکمیل مالویہ جی کا دست شفقت امجد کے سر پر رہا۔جناب انصار احمد استاذ نیشنل انٹرمیڈیٹ کالج محمد پور نے امجد اور مالویہ جی کے مابین تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''......جب آپ بنارس میں تھے فرقہ وارانہ فساد ہوا۔آپ کے والد کو شدید پریشانی ہوئی انہوں نے پنڈت جواہر لال نہرو کو آگاہ کیا۔انہوں نے مدن موہن مالویہ جی کو ایک خط لکھا۔مالویہ جی نے یونیورسٹی کے تمام طالب علموں کو اکٹھا کیا اور امجد صاحب کو اپنے قریب بلا کر کہا کہ یہ امجد ہے۔پنڈت جی کے اور میرے بہت قریب ہے۔اس کے والد نے حب الوطنی کی وہ مثال دی ہے جو تاریخ میں سنہرے حروف میں لکھی جائے گی۔پھر مالویہ جی آپ سے مخاطب ہوئے بیٹے تعلیم مکمل کرکے پنڈت جی کی سفارش پر اعلیٰ عہدہ پا سکتے ہو۔آپ نے جواب دیا واپس جا کر اپنے گاؤں اور دیار

سے جہالت مٹانے کے لئے کوشاں ہوں گا۔ میں پنڈت جی کی طرح ملک اورقوم کی خدمت کا جذبہ رکھتا ہوں مجھے نوکری سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" ۲۴؎

بی ایچ یو سے آپ نے ۱۹۴۰ء میں ایل ایل بی کی تعلیم مکمل کی اور سول کورٹ اعظم گڑھ میں باقاعدگی کے ساتھ پریکٹس شروع کی۔ یہی وکالت آپ کا ذریعہ معاش تھی اور اس کا سلسلہ ۱۹۹۲ء تک چلتا رہا۔

امجد غزنوی ایک شاعرانہ شخصیت لے کر پیدا ہوئے تھے۔ ان کا تخم شاعری بہت جلد ایک شجر برگ وبار کی شکل اختیار کر گیا۔ انہیں ماحول ہی اتنا سازگار ملا تھا کہ ان کے احساس کی مٹی ہمیشہ نم رہی۔ ان کے سن بلوغ کو پہنچنے سے قبل ان کے اشعار بالغ ہو چکے تھے۔

ان کے گرد وپیش میں اتنے پختہ مشق اور تجربہ کار اساتذہ موجود تھے جن سے غیر شعوری طور پر امجد کا کم سن ذہن تربیت حاصل کرتا رہا۔ استاذی اور شاگردی کی روایت اردو شاعری میں عقیدے کی حد تک داخل ہے۔ چنانچہ امجد نے بھی اس روایت کی پاسداری کی۔ اور سب سے پہلے انہوں نے اعظم گڑھ کے استاذ شاعر کلام جیراجپوری سے مشورہ سخن کیا۔ فاضل استاذ نے لائق شاگرد کے تیور پہچانتے ہوئے مثبت اور مناسب سمت میں رہنمائی کی۔ اور علامہ اقبال سہیل نے منزل سے ہمکنار کیا۔ امجد نے ہمیشہ صحت مند قسم کی شاعری کی۔ غزل میں تصوف، عصر آگہی، اور گرد وپیش کو اپنا موضوع سخن بنایا۔ وہ شاعری میں عامیانہ وسوقیانہ شاعری کے قائل نہیں تھے۔ مثال کے طور پر ان کا یہ شعر پیش کیا جا سکتا ہے۔

چھیڑا نہ کرو تذکرۂ عارض وکاکل
میرے لئے حسن سحر وشام بہت ہے

امجد کے ذوق جمال نے تاحیات لیلائے ادب کی ناز برداری کی۔ اور وہ اس کی ہر ادا پر عاشق تھے۔ انہوں نے خود کو کسی ادبی تحریک سے وابستہ نہیں کیا۔ وہ ادب میں مقصدیت کے قائل تھے لیکن یہ فریضہ کسی نعرے یا پروپگنڈے کے ساتھ نہیں ادا کرنا چاہتے تھے۔ ان کی شاعری کا مقصد اقدار انسانی کا فروغ اور قوم ومعاشرہ کی اصلاح تھا۔ لہٰذا اپنے پیغام کی ترسیل کے لئے انہوں نے "اک کہے اور دوسرا

سمجھے'' کی روش اختیار کی۔

انہوں نے شاعری عوام کے لئے کی۔ وہ اپنی ذات کے خول میں بند نہیں رہے، بلکہ ان کی نظر کائنات پر تھی۔ لہٰذا جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے ابہام و اندیشے اور تجریدیت ولا دینیت کے لئے آپ کی شاعری میں کوئی مقام نہیں، اور ترقی پسند تحریک کو تو انہوں نے عارضی چمک دمک سے تعبیر کیا۔ جب اس تحریک کی بنیاد پڑی تو امجد بغرض تعلیم گورکھپور میں مقیم تھے۔ اور مجنوں گورکھپوری اور فراق گورکھپوری کے ہم محفل ہوا کرتے تھے۔ فراق اور مجنوں دونوں اس وقت ترقی پسند نقطۂ نظر کے مخالف تھے۔ امجد نے اس تحریک کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ وہ اس تحریک کو اردو کی ترقی کے پردے میں مذہب بیزاری اور کمیونزم کی تبلیغ و تشہیر کا ذریعہ تصور کرتے تھے۔ لہٰذا کہتے ہیں:

فضا میں روشنی ہی روشنی معلوم ہوتی ہے
مگر یہ روشنی تو عارضی معلوم ہوتی ہے
چمن میں آفتاب نو کی اف ان سرخ کرنوں میں
مجھے تو تیرگی ہی تیرگی معلوم ہوتی ہے
آنکھیں اٹھاکے دیکھ اسیر شعاع نو
دیکھا ہے تو نے پرتوحسن بشر کہاں
نہ مہر نو تھا درخشاں نہ سرخ کرنیں تھیں
شعاع نور بشر جب بکھیر دی میں نے
شمع دانش سے کیا رونق بزم ہو
شمع دل جب تری نور افشاں نہیں
شعاع نورحق اس بزم میں کیا جلوہ فرما ہو
حقیقت بن گئی بس بزم میں افسانہ برسوں سے
گلزار جہاں میں جلوہ فگن پھر نور عرفاں ہوتا ہے

ان سرخ وسیاہ بلاؤں سے پھر پاک گلستاں ہوتا ہے

مذکورہ بالا اشعار سے امجد کے مسلک شاعری کا بہ خوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔انہوں نے ہر نظریے کے خیر مقدم کے لئے اپنی فکر کے دریچے کھلے رکھے۔لیکن انہوں نے ان کے صرف صحت مند اور آفاقی عناصر کو ہی قبول کیا۔جدید سے جدید تجربات کو اپنی شاعری کا موضوع بنانے کے باوجود انہوں نے اظہار کے لئے کلاسیکی انداز ہی اپنایا اور اپنی قادرالکلامی سے یہ ثابت کر دیا کہ قدیم سے قدیم تر اور جدید سے جدید تر خیالات ونظریات کلاسیکی شاعری کے لباس میں ساری ادبی نزاکتوں اور فنی لطافتوں کے ساتھ پیش کئے جا سکتے ہیں۔

معین احسن جذبی

معین احسن جذبی ۲۱ ؍اگست ۱۹۱۲ء قصبہ مبارک پور ضلع اعظم گڑھ یوپی میں ایک علمی و ادبی گھرانے میں پیدا ہوئے ،ان کا اصل نام معین احسن اور جذبیؔ تخلص تھا ان کی شاعری کم وبیش پچھتر برسوں پر محیط ہے ،کیونکہ ان کی پہلی تخلیق ۱۹۲۹ء کی ہے اور آخری تخلیق ۲۰۰۴ء کی جو ان کے انتقال ۲۰۰۵ء سے ایک سال قبل کی ہے،لیکن حقیقت یہ ہے کہ ’’فروزاں‘‘ ۱۹۴۳ء ’’سخن مختصر‘‘ ۱۹۶۰ء اور ان کے تیسرے مجموعے ’’گداز شب‘‘ ۱۹۸۵ء جو ان کے کلام کا حاصل کلام بھی ہے کے منظر عام پر آنے کے بعد جذبی بمشکل دس گیارہ غزلیں ہی کہہ سکے ،وہ کم گو کم سخن ضرور تھے لیکن اتنے بھی نہیں کہ بیس برسوں میں صرف دس گیارہ غزلیں ہی کہیں ،دراصل ’’گداز شب‘‘ ہی ان کا آخری پڑاؤ تھا۔حالانکہ انہوں نے زندگی ہی میں اپنا کلیات مرتب کر لیا تھا اور جو ان کے انتقال کے بعد ساہتیہ اکادمی نئی دہلی کے زیر اہتمام ۲۰۰۶ء میں شائع ہوا۔

جذبی کے شعری سفر کے دوران ادبی دنیا میں بہت سے سیاسی ،سماجی ،تغیرات رونماں ہوئے۔ کئی تحریکیں ظہور پذیر ہوئیں ۔ان کا عروج وزوال بھی ہوا۔رومانیت کا اثر زائل ہوا۔ترقی پسندی مصلحت کا شکار ہوئی۔جدیدیت بے اثر ہوگئی۔اور مابعد جدیدیت کے خدوخال نمایاں ہوئے جذبی نے

ان تمام ہنگامہ خیز تبدیلیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔انہوں نے بہتوں کی وقتی شہرت بھی دیکھی۔ بہتوں کو آسمان سے زمین پر آتے ہوئے بھی دیکھا۔کوتاہ قد شاعروں کو دراز قد ہوتے ہوئے اور دراز قد شاعروں کو کوکوتاہ قد ہوتے بھی دیکھا۔لیکن خود انہوں نے کبھی شہرت کے لئے جست لگانے کی کوشش نہیں کی ۔روایت کی پاسداری ،حقیقت نگاری ،ترقی پسندی بلندی،احساس غم کی گراں باری ،قنوطیت میں رجائیت کی شانہ کاری اور جمالیات کی تازگی ان کی شاعری کے اہم عناصر ہیں ان کے یہاں نظم اور غزل کے آئین وآداب سے گہری ہم آہنگی بھی ملتی ہےاور ترقی پسند شاعری کے بنیادی تقاضوں سے ہم آہنگی بھی ،فکر میں تازگی ،اظہار واسلوب میں ٹھہراؤ،توازن اوراعتدال ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔

انہوں نے شاعری کی صدیوں پرانی روایت کی توسیع کے لئے ہر ممکن کوشش کی ،ترقی پسندی کو کشادگی بخشی اوران کی خطیبانہ رومانیت جذباتیت ٹائپ کی سطحیت اور غیر تخلیق نوعیت کی اشتہاریت سے خود کو محفوظ رکھا، نیز تخلیق کی آزادی پر ہمیشہ اصرار کیا، جذبی کے پیش نظر ادب کا مقصدی اورافادی پہلو بھی رہا ہے،لیکن انہوں نے ادب کی ادبیت اور زندگی کی ہمہ جہت ترجمانی کو بنیادی اہمیت دی ،ادب میں داخلی اور خارجی دونوں تقاضوں کے وہ قائل تھےانہوں نے اپنی شاعری میں انسان کوایک محشر خیال کے طور پر دیکھااورانسان کے پاکیزہ احساسات وجذبات کو پیش کرنے کی تڑپ نے ان کے کلام کو پراثر بنادیا،کم گوئی ،کم سخنی ،اورکم آمیزی ان کے افتادطبع اور تخلیقی مزاج کا حصہ تھی زندگی کے آخری ایام تک وہ انسانی قدروں کے ترجمان رہے نیز ان کی شخصیت میں عجز وحلم تھاانہوں نے کبھی صلے کی پرواہ نہیں کی مگر ناقدریٔ زمانہ کا شکوہ ضرور کیا۔

یہاں نہ شعر سناؤ یہاں نہ شعر کہو
خزاں پرستوں میں گلہائے ترقی کی قیمت کیا

معین احسن جذبی بنیادی طور پر غزل کے شاعر سمجھے جاتے ہیں لیکن نظم کے میدان میں بھی انہوں نے کمال فن دکھایا ہے۔اس لئے صرف انہیں غزل کا شاعر کہنا غلط ہوگا۔وہ نظم کے بھی اتنے اچھے شاعر ہیں جتنے غزل کے ہاں یہ ضرور ہے کہ نظموں کے مقابلے ان کی غزلیں زیادہ یاد رکھی گئیں ان کی

غزلوں کا ایک اہم حصہ اپنی منفرد معنویت اور اثر انگیزی سے پر ہے اگر جذبی کی پوری شاعری پر نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں شاعری کے تین ادوار ملتے ہیں۔

پہلا دور کلاسیکیت سے عبارت ہے، یعنی اساتذہ کے رنگ میں شعر کہنے کا ہے اس دور میں ان کی داخلی کیفیات خوب ملتی ہے، قنوطی رنگ و آہنگ کو خوب محسوس کیا جا سکتا ہے، فانی کے ساتھ ان کے استادانِ سخن صادق جھانسوی اور حامد شاہ جہاں پوری کی تربیت اور رہبری کا بے ساختہ اظہار ملتا ہے ،ذاتی تجربات کو الفاظ کے سانچے میں ڈھالنے کا ہنر جذبی نے اپنے انہیں استادِ فن سے سیکھا، جذبی کی یہ وہ خوبی ہے جس سے ان کا شعری کمال نمایاں ہوتا ہے

اس دور کے چند اشعار ملاحظہ کیجیئے:

غم کی تصویر بن گیا ہوں میں
خاطر درد آ شنا ہوں میں

....

تمہارے حسن کے جلووں کی شوخیاں تو یہ
نظر آتے نہیں دل پہ چھائے جا تے ہیں

....

ہم بھی تو سن رہے تھے رعنائی گلستاں
باد خزاں سے جو کچھ کلیوں نے آرزو کی

....

اک بن گیا فرزانہ اک ہوگیا سودائی
تھا جتنا جو ظرف اس میں اتنی ہی شراب آئی

....

جذبی کا دوسرا دور وہ ہے جس میں ان کے یہاں اسلوب میں پختگی سماجی مسائل سے گہری وابستگی اور فنی بالیدگی نظر آتی ہے نیز واردات قلبی کا برملا اظہار ملتا ہے۔اس دور کی شاعری سے فن کی نزاکتوں کا بھی بخوبی احساس ہوتا ہے اور ان کے مبہم نقش پر سے پردہ اٹھتا ہے، انہوں نے جس منزل

موہوم کا سفر شروع کیا تھا وہ نظر آنے لگتی ہے، ان کی غزلوں اور نظموں میں ترقی پسند رجائیت کا عنصر غالب آگیا ہے ان کا غم ذاتی غم نہیں رہا، بلکہ پوری کائنات سے وابستہ ہوگیا ہے۔اس فکر کو ترقی پسند نظریے نے تقویت بخشی لیکن اس دور میں ان کے یہاں ایسی بہت سی نظمیں مل جاتی ہیں، جن سے عشق کی سرمستیاں اور شوخیاں اجاگر ہوتی ہیں ''ہلال عید''، ''ایک دوست سے''، ''راز و نیاز''، ''حسن برہم''، ''فطرت''، ''ایک مفلس کی نظر میں''، ''خواب ہستی''، ''موت''، ''نیا سورج''، ''میری شاعری'' اور ''نقاد طوائف'' اور ''میرے سوا'' جیسی خوبصورت نظمیں اسی دور کی یادگار ہیں جو درد وغم ان کے یہاں پہلے تھے وہ بعد کی غزلوں میں بھی ملتے ہیں لیکن ان کی کیفیت الگ الگ ہے ان کا غم کہیں ذاتی ہے کہیں کائناتی اور کہیں وہی غم قدر کی علامت بن جاتا ہے دوسرے دور کی شاعری میں ان کے غم کی نوعیت بالکل بدل سی گئی ہے۔

یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

مختصر یہ ہے کہ ہمدم میں نے فرط شوق میں
اپنی ہستی کو بھی وقف درد پنہاں کر دیا

....

کس قدر معصوم کیسی گرم ، کتنی دل نواز
وہ نگاہ ناز جو بدنام ہے میرے لیے

....

تو اور غم الفت جذبی مجھ کو تو یقین آئے نہ کبھی
جس قلب پہ ٹوٹے ہوں پتھر اس قلب میں نشتر ٹوٹ گئے

جذبی کی شاعری کا تیسرا دور وہ ہے جس میں انھوں نے زندگی کا جو بہتر خواب دیکھا اسے اپنی غزلوں میں برمحل استعمال کیا۔گردوپیش کی حقیقتوں کو آشکارا کیا۔یہ وہ دور ہے جس میں فیض کی غزلوں کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔جذبی فیض سے متاثر ہوئے اور کئی عمدہ غزلیں کہیں نیز جذبی نے اسے اپنی شاعری کے آس پاس بھی پھٹکنے نہیں دیا اور ایسے بہت سے اشعار کہے جو ترقی پسند ادبی نقطہ نظر کے غماز

ٹھہرے۔ یہ اشعار ملاحظہ کیجئے۔

جفا کی طرز بدلی ،خسرو شیریں سخن بدلا
مگر اس سے بھی کچھ بڑھ کر مزاج کوہکن بدلا

....

یہ دل کا داغ جو چمکے تو کیسی تاریکی
اسی گھٹا میں چلیں ہم اسی گہن میں چلیں

....

یہ رنگ کیا ہے تری بزم مئے کا پیر مغاں
نہ خم، نہ شیشے، نہ ساغر ،نہ جام آتے ہیں

دراصل اسی دور میں جذبی نے فکر اور فن دونوں سطح پر اپنا جوہر دکھایا۔ بعد کے دنوں میں ان کی غزلوں میں لفظ سے زیادہ لہجہ غالب آ گیا۔ انھوں نے ایسے ایسے بلیغ استعاروں کا استعمال کیا جن کا ان سے پہلے نہیں کیا گیا تھا۔ اسی مخصوص لہجے کے سبب ان کے یہاں معانی میں ایسا نیا پن پیدا ہوا کہ اہل ذوق سر دھنتے تھے ''معرکہ ہائے چمن''، ''نالہ شب تاب''، '' آسودگان سایہ دیوار''، '' حریف الم لا متناہی''، ''لغزش پائے ثبات''، ''دیوانگی شوق''، ''تیشہ''، ''سنگ گراں'' وغیرہ استعاروں سے انھوں نے سیاسی وسماجی سروکار کو بڑی فنی چابک دستی سے پیش کیا ہے۔

جذبی کی شاعری کا تیسرا دور حزن وملال سے عبارت نہیں ہے۔ بلکہ درد وغم میں ایک ایسی تمکنت ہے جو دلوں کو چھو جاتی ہے۔ محبت، صداقت اور شرافت ایسا غرور ہے جو فن کو بلندیوں پر پہنچاتا ہے۔ تبھی تو جذبی نے یہ کہا کہ

لب سی لئے جو خندۂ یاراں کے خوف سے
برسوں ہمارے سینے میں طوفان سے رہے

....

گلشن میں جوش گل تو بگولہ ہیں دشت میں

اہل جنوں جہاں بھی رہے آن سے رہے

جذبی کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں متعدد ادبی ایوارڈز سے نوازہ گیا تھا۔ جن میں غالب ایوارڈ (۱۹۷۵) افتخار میر (۱۹۸۳) ہریانہ اردو اکادمی ایوارڈ (۹۲-۱۹۹۱) اقبال سمان (۹۴-۱۹۹۳) کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ (اردو اکادمی دہلی ۱۹۹۳) اعزاز غالب (غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی ۲۰۰۰) اور امریکہ کا کنیز حسین میموریل ایوارڈ (۲۰۰۱) قابل ذکر ہیں۔ ان کے کلام کا انگریزی اور ہندی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے

مجموعی اعتبار سے یہ کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جذبی کا مزاج شاعرانہ، دماغ عارفانہ اور مسلک قلندرانہ تھا اور انہوں نے اپنے فکر و فن کو بھی اسی سے ہم آہنگ کیا۔ زندگی کی تلخ سچائیوں اور انسانی تہذیبی قدروں کی پیش کش کو انہوں نے ترجیح دی۔ انکے یہاں موضوعات میں رنگا نگی ہے ان کی شاعری ضبط و تحمل اور انکساری سے عبارت ہے حزن و ملال، یاس و حرمان ان کا بنیادی رنگ ہے تو رجائیت ان کے کلام میں رچی بسی ہے، انھوں نے داخلیت و یاسیت کی پاسداری کی تو روایت کا بھی لحاظ رکھا۔ اور کشت رومانیت کی آبیاری بھی کی۔ انھوں نے کبھی کسی کی ترغیب اور تنبیہ قبول نہیں کی بلکہ جو کچھ محسوس کیا اسے شعری پیکر عطا کیا۔ کلام میں اعتدال پسندی اور توازن ہر جگہ قائم ہے۔ ان کے اشعار میں ایسی تازگی، رکھ رکھاو، بشاشت اور تمکنت ہے جس سے ان کی پوری شعری کائنات روشن دکھائی دیتی ہے۔

بحیثیت مجموعی یہی وہ تمام شعراء ہیں جن کا تذکرہ ہم نے انور اعظمی سے پہلے اعظم گڑھ میں اردو شاعری کے حوالے سے کیا ہے۔ اس زمانے کے تقریبا تمام شعراء استاذ فن کی حیثیت رکھتے تھے۔ بعد کے شعراء نے انہیں شعراء کرام سے استفادہ کیا ہے۔ اور ان کی شاعری پر کم و بیش انہیں اساتذۂ فن کا رنگ غالب ہے۔ اس باب میں کچھ شاعر ایسے بھی ہیں جن کا شعری سفر انور اعظمی سے بعد تک ہے۔ کیونکہ انور اعظمی اس دنیائے فانی میں بہت ہی قلیل مدت تک زندہ رہے۔ اگلے باب میں ہم ان شعراء کے حوالے سے اردو شاعری کا تذکرہ کریں گے جس سے انور اعظمی کے زمانہ میں اعظم گڑھ میں اردو شاعری کے خدوخال واضح ہوسکیں۔

انور اعظمی کے دور میں اردو شاعری

ضلع اعظم گڑھ اپنے وجود میں آنے سے لے کر آج تک علماء، فضلاء، ادباء، شعراء اور ارباب فکر ونظر سے بھرا پڑا ہے۔ لیکن زمانے کی ستم ظریفی دیکھیے کہ تذکرہ تاریخ مرتب کرنے والوں نے ان کی طرف خاطر خواہ توجہ نہ دے کر حقائق سے چشم پوشی اور اپنے علمی فرائض سے روگردانی کی ہے۔ جہاں تک اردو ادب کا سوال ہے اس خطے نے اس کی مختلف اصناف میں جو خدمات انجام دی ہیں وہ اہل علم کی نظروں سے کسی بھی طرح اوجھل نہ ہوسکیں۔ اردو کے صاحب طرز نثر نگاروں میں سرسید، مہدی افادی، ابوالکلام آزاد، ابوالحسن علی میاں ندوی، سید سلیمان ندوی، عبدالماجد دریابادی، شاہ معین الدین ندوی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن وغیرہ نے کسی نہ کسی انداز میں اس دیار علم وادب سے روشنی حاصل کی ہے۔ میرا یہ باب چونکہ انور اعظمی کے دور میں اردو شاعری کے حوالے سے ہے اس لئے یہاں پر ہم ان شعراء کا تذکرہ کریں گے جنھوں نے اس دور میں اردو شاعری میں اپنی خدمات انجام دی ہیں۔

کیفی اعظمی

بیسویں صدی میں اعظم گڑھ نے بہت سے نامور اور صاحب کمال شعراء پیدا کئے ان میں ایک مشہور ومقبول، ترقی پسند اور انقلابی شاعر کیفی اعظمی ہیں۔ ان کا نام سید اطہر حسین رضوی تھا، وہ اعظم گڑھ کے ایک چھوٹے سے گاؤں مجواں میں ۱۹۱۸ء میں پیدا ہوئے تھے والد محترم نے اپنے بڑے بیٹوں کو انگریزی تعلیم دلائی مگر کیفی کو عربی تعلیم کی غرض سے فرقہ امامیہ کی مشہور درسگاہ سلطان المدارس لکھنؤ میں داخل کیا۔ مگر کیفی نے مدرسہ کے قواعد وضوابط کی سختی سے گھبرا کر صرف تعلیم ہی نہیں چھوڑی بلکہ اپنے آپ کو مذہبی قیود سے بھی آزاد کرلیا۔ تعلیم چھوڑنے کے باوجود انھوں نے لکھنؤ اور الہ آباد یونیورسٹیوں سے مشرقی امتحانات دیے اور اپنی محنت ومطالعہ سے اپنی استعداد بڑھائی۔ اردو فارسی کے علاوہ غالباً وہ عربی ہندی اور سنسکرت سے بھی واقف تھے۔

کیفی اعظمی کی پہچان ان کی شاعری سے ہے جس کو ان کے مخصوص لب ولہجہ، باغیانہ تیور اور

انقلابی افکار وخیالات کی بنا پر بہت پسند کیا گیا۔ان کے گھر میں پہلے ہی سے شعر وسخن کا چرچہ تھا۔اردو ہی نہیں فارسی کا ذوق بھی سب کو تھا۔ان کے تینوں بڑے بھائی شاعری کا مذاق رکھتے تھے اور صاحب بیاض تھے۔خاندانی کتب خانہ میں اردو، فارسی اور عربی شعراء کے دواوین تھے جو بچپن ہی سے ان کے مطالعہ میں رہتے تھے۔اس شاعرانہ ماحول میں وہ گیارہ برس کی عمر ہی سے شعر کہنے لگے تھے۔شاعری میں انہوں نے کبھی کسی سے اصلاح نہیں لی۔ان کا ذوق ہی ان کا اصلی راہبر تھا۔تاہم لسان القوم حضرت صفی لکھنوی مرحوم کی ادب پرور صحبتوں سے انہوں نے بہت کچھ فیض اٹھایا۔کیفی نے اپنی شاعری کی ابتدا روایتی شاعری سے کی، شروع میں حسن وعشق اور گل وبلبل سے الجھے مگر جب ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوئے تو ان کی شاعری کا رنگ وآہنگ تبدیل ہو گیا اور روایتی شاعری کا کوچہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا۔

اردو کی ترقی پسند تحریک سے ان کا گہرا تعلق تھا اور وہ اس کے اہم ستون خیال کئے جاتے تھے۔ کمیونسٹ پارٹی کے بھی سرگرم رکن تھے، اشتراکیت اور ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے بعد ان کی شاعری عارض وکاکل کی حکایت اور گل وبلبل کا تذکرہ نہیں رہی بلکہ وہ اپنے دردمند دل کی داستان سنانے اور زندگی وسماج کے پیچیدہ مسائل کی گتھیاں سلجھانے اور اس طرح کے غزلیہ اشعار کہنے لگے۔

میں ڈھونڈتا ہوں جسے وہ جہاں نہیں ملتا　　　نئی زمین نیا آسماں نہیں ملتا
نئی زمیں نیا آسماں تو مل جائے　　　نئے بشر کا کہیں کچھ نشاں نہیں ملتا

ان کے نزدیک زندگی جدوجہد بن گئی:

زندگی جہد میں ہے صبر کے قابو میں نہیں
نبض ہستی کا لہو کانپتے آنسو میں نہیں

لیکن اس کے باوجود انہیں غزل کی تنگ دامانی کا احساس ہونے لگا، اس لئے سیاسی وسماجی اور انقلابی نظمیں لکھ کر قوم کے اندر باغیانہ اور احتجاجی خیالات کی پرورش کرنے لگے۔ان کی نظموں میں بڑی گھن گرج، جوش خروش اور روانی تھی انداز بھی بڑا انوکھا اور منفرد تھا۔جس سے وہ عجیب ڈرامائی کیفیت پیدا کر کے سامعین کو مسحور ومرعوب کر دیتے تھے ان کی شاعری سوز وگداز اور درد واثر کا مرقع ہوتی تھی۔

کیفی اعظمی کا قلم مجبوروں، مظلوموں اور مراعات سے محروم طبقوں کے لئے وقف ہو گیا تھا۔ ان کی شاعری مساوات، ہمدردی، ایکتا، انصاف، جمہوریت، انسان دوستی اور قومی یک جہتی کا پیغام بن گئی تھی۔ غریبی، مفلسی، فرقہ پرستی اور فسطائیت کے خلاف احتجاج کرنا ان کا شیوہ ہو گیا تھا اور مزدوروں، کسانوں اور کمزوروں کے وکیل اور ترجمان ہو گئے تھے۔

ان کی جن نظموں کو بڑی شہرت وقبولیت نصیب ہوئی ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔ اندیشے، زندگی، ایک لمحہ، ابن مریم، بہروپنی، عورت، دوسرا بن باس، تلنگانہ، مکان وغیرہ۔ مؤخر الذکر کے یہ دو شعر ملاحظہ ہوں:

آج کی رات بہت گرم ہوا چلتی ہے
آج کی رات نہ فٹ پاتھ پہ نیند آئے گی
سب اٹھو میں بھی اٹھوں تم بھی اٹھو تم بھی اٹھو
کوئی کھڑکی اس دیوار میں کھل جائے گی

ان کے بعض اور اشعار بھی دیکھئے:

اعلان حق میں پھنس گیا دارورسن تو گیا
لیکن سوال یہ ہے کہ دار و رسن کے بعد
انسان کی خواہشوں کی کوئی انتہا نہیں
دو گز زمیں بھی چاہئے دو گز کفن کے بعد

دستور کیا یہ شہر ستم گر کے ہو گئے — دیکھا جو مڑ کے ہم نے وہ پتھر کے ہو گئے
شور یوں ہی پرندوں نے مچایا ہوگا — کوئی جنگل کی طرف شہر سے آیا ہوگا

اعظمی کی گرانقدر خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے حکومت ہند نے ان کو ''پدم شری'' کے اعزاز سے نوازا لیکن انہوں نے قبول نہیں کیا۔ بہترین کہانی کا پریسیڈنٹ ایوارڈ بھی لینے سے انکار کر دیا۔ اس کے علاوہ دلی سرکار (اردو اکادمی) کا میلینیم ایوارڈ، حکومت اتر پردیش کا ایوارڈ، ساہتیہ اکادمی

ایوارڈ ،اتر پردیش اکادمی ایوارڈ ،مہاراشٹر اردو اکادمی ایوارڈ ،سویت لینڈ نہرو ایوارڈ،قومی یکجہتی کا پریسیڈنٹ ایوارڈ،بہترین کہانی کا فلم فیئر ایوارڈ،ریاست مہاراشٹر کا گوروا ایوارڈ،ساہتیہ اکادمی فیلوشپ اور ہندی اردوادب ایوارڈ کمیٹی (اتر پردیش) وغیرہ کے ایوارڈ بھی ان کو عطا کئے گئے۔

کیفی اعظمی کے شعری مجموعے پہلا ''جھنکار'' ۱۹۴۴ء میں، دوسرا '' آخرشب'' ۱۹۴۷ء میں، تیسرا '' آوارہ سجدے'' ۱۹۷۴ء میں، فلمی نغمے ''میری آواز سنو'' ۱۹۷۴ء میں '' ساحرلدھیانوی'' (طویل خاکہ)،''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' (دوسرااجلاس) ۱۹۷۷ء میں،''سرمایہ'' کلیات ۱۹۹۴ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آئے۔ یہ تمام کتابیں کیفی اعظمی کی زندگی میں شائع ہوچکی تھیں،ان کی وفات کے بعد ان کے عقیدت مندوں نے ان کا منتخب کلام '' کیفیات'' کے نام سے شائع کیا۔

شمیم کرہانی

اعظم گڑھ کے شعراء کی فہرست میں شمیم کرہانی کسی تعارف کے محتاج نہیں، بہ حیثیت شاعر انہیں عالم گیر شہرت حاصل ہے لہٰذا ان کے فن پر کسی تبصرے یا تعارف کی ضرورت نہیں۔البتہ یہ وضاحت ضروری ہے کہ آپ ایک اچھے نثر نگار بھی تھے۔حالانکہ نثر میں ان کی کوئی علیٰحدہ تصنیف نہیں ہے لیکن نثر میں جتنے مضامین انہوں نے لکھے ہیں ان کو یکجا کر دیا جائے تو ایک اچھی کتاب سامنے آسکتی ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے قواعد پر بھی کتاب لکھی۔آپ کی شخصیت اور فن پر ڈاکٹر سید خواجہ علی انجم نے تحقیقی مقالہ لکھ کر ناگپور یونیورسٹی سے پی،ایچ،ڈی کی ڈگری حاصل کی۔آپ کی شاعری کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

دیکھ کر میکدے پہ ابر بہار
رند مفلس کی آنکھ بھر آئی

ڈاکٹر انجم کے مطابق یہ ۱۹۳۰ء میں لکھا گیا ہے یہ شعر ظاہر کرتا ہے کہ آپ کی نظر نوعمری ہی سے سماجی مسائل،عدم مساوات پر کتنی گہری تھی۔آپ کی تخلیقات پر تبصرہ کرنا ممکن نہیں ہے البتہ ان کی شعری جہات کو سمجھنے کے لئے ان کی تصانیف درج کی جاتی ہیں۔''برق و باراں''،نظمیں،''ترانے''،نظمیں،''

روشن اندھیرا'' انقلابی نظمیں، ''شمیم کرہانی'' (انتخاب کلام)، ''ذوالفقار'' (مدح ذوالفقار میں طویل نظم)، ''حرف نیم شب'' (غزلیں)، ''عکس گل'' (نظمیں اور غزلیں)، ''جان برادر'' (احتشام حسین کی وفات پر طویل نظم)، ''انگارے اور گیت'' (مسز فریڈا بیدی کے انگریزی گیتوں کا منظوم ترجمہ)، ''صبح فاراں''، ''میں بوترابی''، ''تلاش سحر'' اور ''کلید انشاء'' وغیرہ۔

آخر میں شمیم کرمانی کا ایک خوبصورت رومانی شعر درج کیا جاتا ہے:

رنگ خوشبو صبا چاند تارے کرن پھول شبنم شفق آبجو چاندنی
تیری دلکش جوانی کی تکمیل میں حسن فطرت کی ہر چیز کام آگئی

خلیل الرحمٰن اعظمی

خلیل الرحمٰن اعظمی ۹ ر اگست ۱۹۲۷ء کو ضلع اعظم گڑھ میں واقع قصبہ سرائے میر کے ایک گاؤں سیدھا سلطان پور میں پیدا ہوئے۔ اعظمی کا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا جو اپنی مذہبی و ادبی روایات اور خصوصیات کی وجہ سے ممتاز تھا۔ آپ کے چچا قادر بخش نامی گرامی بزرگ تھے، ان کے والد مولانا محمد شفیع ایک ممتاز اور جید عالم دین تھے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کی ابتدائی تعلیم گاؤں کے ایک مکتب میں ہوئی۔ آپ پانچ بھائی بہن تھے، عزیز الرحمان، طبیب الرحمان، عبدالرحمان، خلیل الرحمان، صغرا خانم۔ ان سب کی تعلیم اسی مکتب میں ہوئی۔ خلیل الرحمان اپنے تمام بھائیوں میں سب سے تیز اور ذہین تھے۔ انہوں نے کم مدت میں قرآن مجید ختم کر لیا تھا۔ اس کے بعد پاس کے گاؤں بینا پارہ میں درجہ چہارم تک تعلیم حاصل کی۔ اعظمی کو اسی زمانے میں شعر و شاعری سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ اور بہت سے اشعار یاد ہو گئے۔ بقول پرواز اصلاحی:

> **''اسی زمانے میں ہمارے گاؤں میں اکثر علماء آتے۔ ان میں بعض تو سیدھی سادی تقریر کرتے اور بعض اپنے وعظوں میں ترنم سے اشعار پڑھتے، خلیل الرحمان ان میں ضرور شرکت کرتے اور اپنی پسند کے اشعار یاد کر لیتے''** [۲۳]

خلیل الرحمان نے سرائے میر کے مڈل اسکول سے ساتویں درجہ تک تعلیم حاصل کی ۔اس کے بعد انہوں نے مدرسۃ الاصلاح میں رہ کر تھوڑی بہت عربی وفارسی کی تعلیم حاصل کی ۔ مدرسۃ الاصلاح میں دارالمعلومات کے نام سے طلبہ کی لائبریری تھی جس میں کتابوں کا بڑا اچھا ذخیرہ تھا۔انہوں نے اس سے خاطرخواہ طور پر فائدہ اٹھایا۔اقبال،چکبست ، سیماب ،ظفرعلی خاں ،جگر،اصغروغیرہ کا کلام اور پریم چند کے افسانے اورناول ، نئے افسانوں کے بہت سارے مجموعے اسی دور میں ان کے زیرمطالعہ آئے ۔ اس کے بعد جولائی ۱۹۴۱ء میں انہوں نے شبلی کالج میں داخلہ لیا۔دوران تعلیم انہیں دارالمصنفین سے استفادہ کا خاصہ موقع ملا۔اعظم گڑھ میں ان کا قیام کوئی چارسال رہا، جہاں سے انہوں نے ۱۹۴۵ء میں فرسٹ ڈویژن میں میٹرک پاس کیا۔اس کے بعد وہ علی گڑھ آئے ۔ یہاں کی فضا ان کی لئے سازگار ثابت ہوئی اورانہیں اپنے علمی وادبی ذوق وشعور کوجلا بخشنے کا خاطرخواہ موقع ملا۔علی گڑھ میں جس شخصیت سے وہ پہلے پہل قریب ہوئے وہ معین احسن جذبی تھے ۔جن کے گرد اس وقت علی گڑھ میں ادب اور نئے افکار سے دلچسپی رکھنے والے نوجوانوں کا گروہ اکٹھا ہوگیا تھا۔جذبی سے قربت کی وجہ سے انہیں نئی نئی کتابیں اور نئے نئے رسالے دیکھنے کومل جاتے تھے۔جذبی کے حسن سلوک اور مدارات کا ذکران الفاظ میں کرتے ہیں:

”جذبی ہرطرح سے ہم لوگوں کو چاہتے تھے،وہ صرف ادبی معاملات ہی میں نہیں بلکہ ہر معاملے میں رہبری کرتے ۔فیس ومراعات کا مسئلہ،ڈائننگ ہال سے کھانا بند ہوجانے کا اندیشہ،یونیورسٹی اکاؤنٹ جمع نہ ہونے اور نام کٹ جانے کی فکر،امتحان آنے پر ہال کے ٹکٹ حاصل کرنے کا انتظام،غرض جذبی ہمارے دکھ سکھ کے ساتھ ہوگئے ۔میں جب بی،اے میں تھا تو سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر مجھے ہوسٹل سے نکال دیا گیا جذبی صاحب فورا مجھے اپنے گھر لے آئے اورکہا آج سے تم میرے ساتھ رہوگے۔میں قریب قریب دوسال تک جذبی صاحب کے ساتھ اس طرح رہا کہ مجھے ایک لمحہ کے لئے بھی یہ محسوس نہ ہوا کہ میں کسی اور کے گھر پڑا ہوں اوراس کا ممنون

احسان ہوں'' ۲۴؎

بی ،اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد عارضی طور پر ڈیڑھ سو روپئے ماہوار پر یونیورسٹی گزٹ کی ایڈیٹری کا کام مل گیا،مگر اس کی ادارت انہیں راس نہ آسکی اور وہ تھوڑے ہی دنوں میں اس سے کنارہ کش ہو گئے ۔ملازمت سے مستعفی ہونے کے بعد ان کے لئے حصول معاش کا مسئلہ اہم بن گیا تھا اور انہیں علی گڑھ کو خیر آباد کہہ کر بمبئی اور مدراس وغیرہ کا چکر کاٹنا پڑا۔اس دوران ان کا میلان فلمی دنیا کی طرف بھی ہوا مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔

۱۹۵۳ء میں ان کا تقرر بہ حیثیت لکچرر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہو گیا۔چار سال بعد ۱۹۵۷ء میں انہوں نے ترقی پسند ادبی تحریک کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی،ایچ،ڈی کی ڈگری حاصل کی ۔اسی سال ان کی شادی پیلی بھیت میں راشدہ بیگم سے ہوئی۔ان سے چار اولادیں ہوئیں،تین بیٹے اور ایک بیٹی ۔بیٹوں کے نام کامران،سلمان،عدنان ہیں اور بیٹی کا نام ہما فاطمہ۔

خلیل الرحمان اعظمی ۱۹۷۷ء سے مسلسل بیمار رہنے لگے۔انہیں بلڈ کینسر کا عارضہ تھا اس سے دو سال قبل وہ یرقان میں مبتلا رہ چکے تھے،اس کے بعد ان کی صحت پوری طرح بحال نہ ہو سکی،کبھی اچھے رہتے کبھی بیمار،یہاں تک کہ وہ یکم جون ۱۹۷۸ء کو پونے دو بجے دن میں اپنے مکان'' اردو باغ'' میں رحلت فرما گئے۔

خلیل الرحمان اعظمی کی شاعری میں دو واضح اور اساسی پہلو نظر آتے ہیں،ایک ان کی نظم نگاری ہے اور دوسرا قابل ذکر پہلو غزل گوئی کا ہے۔ان کی غزلیں اور نظمیں پڑھنے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی نظموں اور غزلوں میں اپنے نجی اور ذاتی تجربات و مشاہدات اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ان پر ان کی شخصیت کا گہرا عکس نمایاں معلوم ہوتا ہے۔چنانچہ اگر ہم ان کی نظموں اور غزلوں کے متعلق یہ کہیں کہ وہ ان کی زندگی کے بیش بہا اور قیمتی حصے ہیں تو یہ کوئی غلط بات نہ ہوگی،خود خلیل الرحمان اعظمی نے اعلیٰ شاعروں کی خصوصیات کے متعلق بحث کرتے ہوئے ایک جگہ یوں رقم کیا ہے:

''......اعلیٰ شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ جس فلسفہ حیات کو شاعر

نے پیش کیا ہے یا جن اقدار پر اس کا ایمان ہے اس فلسفۂ حیات اور ان اقدار کے بدل جانے کے بعد بھی شاعر کے کلام کی عظمت باقی رہے''۔۲۵

مذکورہ بالا پیرا گراف میں اعظمی نے اعلیٰ شاعری کی جو خصوصیات متعین کی ہیں اس کے پیش نظر اگر ان کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے بہت حد تک خود اپنی بات پر حتی الامکان عمل کرنے کی کوشش کی ہے، انھوں نے تخلیقیت اور واقعیت کی سرحدوں کو اس طرح ملا دیا ہے کہ ان کے درمیان کوئی حد فاصل نظر نہیں آتا۔ انھوں نے پابند، مقفیٰ و مسجع نظموں کے علاوہ ایسی نظمیں بھی لکھی ہیں جو ہیئت اور فارم کے اعتبار سے نئی کہلانے کی مستحق ہیں۔ یعنی ان کے یہاں ایسی نظمیں ملتی ہیں جو قافیہ ورد یف، بحور، اوزان اور مصرعوں کی قید و بند سے آزاد ہیں۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ انھوں نے اردو شاعری کے ماضی اور اس کی روایات سے بھرپور استفادہ کیا۔ مگر اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ انھوں نے اردو شاعری کے قدیم روایات کی پیروی کرتے ہوئے صرف قدیم طرز واسلوب کی شاعری کی ہے بلکہ ان کا قابل قدر کارنامہ اس ضمن میں یہ ہے کہ انھوں نے ''پاس روایات'' کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اپنی ایک علیحدہ راہ متعین کی ہے۔ وہ روایت سے بغاوت اور سراسر انحراف کے قائل نہیں تھے۔ لیکن وہ یہ جانتے تھے کہ روایات کے بعض بنیادی اور قابل تقلید نمونے کو پیش نظر رکھتے ہوئے بعض نئی چیزیں بھی پیش کی جائیں۔ انھوں نے نظم نگاری کے پرانے پیٹرن، پرانی ہیئت اور قدیم فارمولے سے قدرے انحراف کر کے اس میں نئے نئے زاویے تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس میں انہیں کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے۔ لیکن ان کی غزل گوئی کا بہ نظر غائر جائزہ لینے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی غزلوں میں ہیئت کے اعتبار سے کوئی انوکھا یا نیا تجربہ نہیں ملتا۔ لیکن اسی کے ساتھ اس حقیقی امر کی جانب بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ ان کی زندگی ہی میں غزل میں ہیئت اور فارم، لب و لہجے اور زبان و بیان کی وقتاً فوقتاً تھوڑی بہت تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں، مگر کوئی اہم اور مخصوص تبدیلی نظر نہیں آتی۔ اعظمی کی شاعری کے متعلق اردو زبان و ادب کے مشہور و ممتاز نقاد پروفیسر آل احمد سرور ایک جگہ بالکل صحیح رائے قائم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''خلیل الرحمان اعظمی کے '' کاغذی پیرہن '' میں شوخی تحریر کا سبھی کو احساس ہوا تھا، ان کا دوسرا مجموعہ 'نیا عہد نامہ' زندگی اور حسن سے ایک نئی اور گہری محبت کا نقش جمیل بن کر سامنے آیا ہے، اعظمی کی اپنی آواز ہے اپنا لب ولہجہ اور اپنا آہنگ ...... یوں ان کے یہاں میر کی سی نشتریت بھی محسوس ہوتی ہے مگر اس دور کے مسائل اور معاملات کے شعور نے اس نشتریت میں ایک نئی نوک پیدا کر دی ہے۔ آزادی کے بعد اردو کے جن شاعروں کے کلام نے اہل نظر کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے ان میں اعظمی ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی غزلیں اپنے لطیف اشاروں کی بلاغت کی وجہ سے اس دور کے سنگ وساز کی کتنی ہی داستانیں اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں ان کی نظمیں فطرت کے حسن اور دھرتی کی بو باس کے ساتھ کتنے ہی زخموں کے چمن بھی لئے ہوئے ہیں۔ فیشن یا فارمولے سے ہٹ کر اعظمی نے معنیٰ خیز اور قابل قدر شاعری کی ہے۔ ان کے اسلوب میں دھیمی دھیمی بہنے والی جوئے دل نشیں کی سی روانی ہے ان کے خوابوں اور دھندلکوں میں زندگی کا چہرہ کچھ اور روشن نظر آتا ہے۔ '' ۲۶

اعظمی کی شاعری کو ہم تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ان کا پہلا دور ۱۹۴۲ء سے لے کر ۱۹۵۵ء کا مقرر کیا جا سکتا ہے۔ یہ ان کی شاعری کا ابتدائی دور ہے۔ ان کے اس دور کا کلام پہلے مجموعہ '' کاغذی پیرہن '' میں شامل ہے۔ وہ خود اپنی ان نظموں اور غزلوں کے بارے میں فرماتے ہیں:

''...... ناتمام اور ناتراشیدہ نظموں اور غزلوں میں ملے کچھ چیزیں انتخاب کر کے کتابی صورت دینی پڑی '' ۲۷

ان کی شاعری کا دوسرا عہد ۱۹۵۶ء سے لے کر ۱۹۶۵ء تک کا قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس عہد کا کلام '' نیا عہد نامہ '' میں شامل ہے۔ اور ان کی شاعری کا تیسرا اور آخری دور ۱۹۶۶ء سے تا دم مرگ یعنی ۱۹۷۶ء تک کا مانا جائے گا۔ جو دس سال کے طویل عرصے میں مختلف رسائل وجرائد اور اخبارات میں بکھرے پڑے ہیں۔ البتہ ان میں سے کچھ کلام '' زندگی اے زندگی '' کے نام سے ایک مجموعہ کی صورت

میں شائع ہوکر منظر عام پر آ گیا ہے۔ بہر حال اعظمی ابتدا میں میر اور فراق سے متأثر نظر آتے ہیں، لیکن فراق سے کم میر سے زیادہ۔ میر کے انداز کی غزل کا دو شعر ملاحظہ فرمائیے:

خوار ہوئے بدنام ہوئے ، بے حال ہوئے رنجور ہوئے
تجھ سے عشق جتا کر ہم بھی نگر نگر مشہور ہوئے
ترک محبت بھی کر دیکھیں حال ہمارا کیا ہوگا
اس کی ایک جدائی پر تو رگ رگ میں ناسور ہوئے

ان کی نظموں کے کچھ شعر ملاحظہ فرمائیے:

وہی مٹی کا پیارا گھر
نگاہوں میں ابھی تک پھر رہا ہے
وہی سوندھی سی خوشبو اب بھی میرے پیرہن میں ہے
مرے پیارے وطن اے مرے پیارے گاؤں میں تجھ کو نہیں بھولا

(بن لکھی کہانی)

سہاگ لٹ سا گیا سوگوار شمعوں کا
صبا کی گود میں سوئی ہے خاک پروانہ
مجھے نہ چھیڑو کہ اس یاد کے اندھیرے میں
سسک رہا ہے میری زندگی کا افسانہ (جاگتے سائے)

ساقی ساقی ساقی میں متوالا ساقی کا
کم کم کم کم تھم تھم تھم تھم پیالہ پیالہ ساقی کا
ساقی نے سب سب کو پکارا کون ہے میرا؟ کون میرا؟
بڑھ بڑھ کر سب ہی چلائے بول ہے بالا ساقی کا (ساقی نامہ)

بحیثیت مجموعی خلیل الرحمان نے اردو شاعری کی دوصنفوں نظموں اورغزلوں میں جس نئے لہجے اور آہنگ کو پیش کیا ہے وہ کبھی فراموش نہیں کے جا سکتے۔ان کی غزلیں اور ان کی نظمیں پڑھنے کے بعد ہم فوراً اس جانب کھنچے چلے جاتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی زبان آہنگ اورلب ولہجے میں جوتر وتازگی ملتی ہے وہ ہمیں متأثر کئے بغیر نہیں رہتی لہٰذا اس اعتبار سے ان کی شاعری کی قدر و قیمت زیادہ ہے۔

تقسیم ملک ہندستان، پاکستان اور بنگلہ دیش تینوں مما لک کے لئے ایک ایسا حادثۂ جانکاہ ٹھہری کی ہجرت کے سفر کی تھکن آج تک اعصاب پرسوار ہے۔اعظم گڑھ کے کیسے کیسے ''گنج ہائے گراں مایہ'' ہجرت کی نظر ہو گئے۔ بہت سے اعظمیوں نے ذلت کی پستی بھی دیکھی اور بہت سوں کوشہرت کی بلندی بھی نصیب ہوئی۔اعظم گڑھ نے جن جواہر پاروں کوکھویا ان میں سے ایک حسین اعظمی بھی ہیں۔ان کے مجموعہ کلام کے سرورق پر لکھے چار مصرعے سے ان کی قادرالکلامی کے ساتھ اپنی فطرت صبر وشکر اور رضاء وقناعت کے حوالے اپنے شاعرانہ مسلک کا تعارف کرایا ہے وہ چار مصرعے پیش ہیں:

ہزار دولت دنیا بھی ہو تم کو مجھ کو
ملا ہے صورت دل ایک جام جم مجھ کو
کسی کو منصب وکرسی کسی کو طبل وعلم
خوشا نصیب کہ بخشا گیا قلم مجھ کو

راقم الحروف کوصرف ان کے مرثیوں کا ایک مجموعہ مل سکا۔صنف مرثیہ نے اردو زبان کے سرمایۂ الفاظ میں جوگرانقدر اضافہ کیا ہے وہ کسی اورصنف کے حصے میں نہیں آیا۔تاہم موجودہ مرثیہ نگاری کچھ زیادہ اہم نہیں ہے۔کیونکہ میری نظر میں ادب کو پہلے ادب ہونا چاہئے۔ادب میں مقصدیت کی بڑی اہمیت ہے تاہم اس کی پیش کشی کامل فنی طریقے سے ہونی چاہئے۔جہاں فن قربان ہوا مقصدیت ایک پروپگنڈہ بن کررہ جائے گی۔اس لئے ادب کوحقیقت کی نظر سے دیکھنا چاہئے نہ کہ عقیدت کی نظر سے۔یہی وجہ ہے کہ لوگوں کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ بگڑا ہوا شاعر مرثیہ گو بن جاتا ہے۔موجودہ مرثیوں کا بڑا حصہ اسی زمرے میں آتا ہے،عقیدت سے پر اورفن سے عاری۔مرثیوں پرتنقید کرنا گویا

عقیدے پر تنقید کرنا ہے۔اب مرثیہ رورو کر رومال بھگونے اور ''نامۂ اعمال'' دھونے کا ذریعہ بن کر رہ گیا ہے یہی وجہ ہے کہ ادب کا طالب علم مرثیہ سے دور ہوتا چلا گیا۔لیکن حسین اعظمی کے مرثیوں میں یہ قدرت ہے کہ ان کی مقناطیسیت قاری کو اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے اور پورا مجموعہ ایک ہی نشست میں ختم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

حسین اعظمی

حسین اعظمی کے کلام پر مشاہیر ادب کے بڑے پر مغز تبصرے شائع ہوئے ہیں۔پاکستان کے مؤقر روزناموں ''جنگ''، '' حریت'' اور ''ڈان'' وغیرہ نے آپ کے کلام پر بصیرت افروز تبصرے کئے ہیں۔رونامہ ''جنگ'' لکھتا ہے:

''......'حرف حق' ایک جدید مرثیہ ہے جس کا چہرہ دعائیہ ہونے کے ساتھ ساتھ عہد حاضر کے بے عمل اور گم گشتہ منزل معاشرے پر بھرپور طنز ہے......آج بھی انسان حق کا متلاشی ہے اور باطل آج بھی انسانیت اور صداقت کی بیخ کنی پر کمربستہ۔ان بڑھتے ہوئے طوفان اور پھیلتے ہوئے اندھیروں میں آج روشنی کا حصول کیوں کر ممکن ہے۔ وقت کا یہ اہم سوال ہے جناب حسین اعظمی نے وقت کے ان اہم تقاضوں پر اپنے جذبات و محسوسات کو اس طرح منظوم کیا ہے کہ ان کے یہ اشعار بیسویں صدی عیسوی کے اس عہد سامراجیت کے لئے ایک انقلابی پیغام بن گئے ہیں'' ۲۸؎

روزنامہ ''ڈان'' (انگریزی) لکھتا ہے:

''......لطیف اور دل پذیر انداز بیان کے ذریعے قاری کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کرائی گئی ہے کہ موجودہ دور کی برائیاں بلا روک ٹوک اس لئے پھل پھول رہی ہیں کہ ہم اس ابدی صداقت کا ادراک کرنے سے قاصر رہے جسے محمد مصطفیٰ ﷺ کے نواسے نے اپنی عظیم قربانی کے ذریعہ ہم تک پہنچایا ہے......'' ۲۹؎

روزنامہ ''حریت'' لکھتا ہے:

''......**حسین اعظمی کا یہ مرثیہ ''حرف حق'' اس اعتبار سے توجہ کا مستحق ہے کہ انہوں نے اس مرثیہ کے ذریعے موجودہ دور کی استحصال پسند ذہنیت کی نقاب کشائی کی اور بتایا کہ امام حسینؑ نے باطل قوتوں کے خلاف جہاد کیا تھا اور حق کی حفاظت کے لئے اپنی زندگی بھی نچھاور کرنے سے دریغ نہیں کیا تھا۔ آج بھی اسوۂ حسین پر عمل کرتے ہوئے تمام باطل پسند قوتوں اور استحصال پسند طاقتوں کی سرکوبی کی جاسکتی ہے۔ یہی اس مرثیے کے مصنف کا اپنے پڑھنے والوں کے نام پیغام ہے......''** [۳۰]

ڈاکٹر احسن فاروقی معروف نقاد ہیں۔ حسین اعظمی کی مرثیہ نگاری پر انہوں نے بڑا بے لاگ تبصرہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''**اس وقت ہمارے ملک میں ان ریاکاروں کا شوروغوغا بلند ہے جو اسلام کے نام پر کفر برت رہے ہیں۔ ایسے لوگ شروع ہی سے موجود تھے اور جنہوں نے دل سے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ وہ اسلام کی بیخ کنی کرنے اور دین کو مسخ کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ آج پھر اس مکتب فکر کے لوگ اسلام کا لبادہ اوڑھ کر مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں**'' [۳۱]

ایسے علماءِ سوء کے بارے میں اعظمی صاحب کہتے ہیں:

وہی اسلام سے نفرت ہے وہی بیزاری
دین میں تحریف کی کوشش ہے ابھی تک جاری
سر ہے سجدوں میں مگر دل میں بتوں سے یاری
بت پرستوں نے نہیں آج بھی ہمت ہاری
آستینوں میں نہیں دل میں لئے بیٹھے ہیں
کتنے بت خانے یہ محمل میں لئے بیٹھے ہیں

احسن فاروقی نے جناب اعظمی کو مرثیوں کے وسیلے سے گندم نما جوفروشوں اور مسلم نما شیطانوں کی پول کھولنے والا بتایا ہے۔

شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی نے ان الفاظ میں جناب اعظمی کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

''حسین اعظمی کا مرثیہ'' حرف حق'' جابجا سے دیکھا اور اس خیال سے بڑی خوشی ہوئی کہ وہ محبان حسین کو ان کی تقلید کی جانب پکار رہے ہیں۔

''...... حسین کی شہادت پر جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے لیکن سوگواران حسین کو یہ معلوم نہیں کہ حسین نے اجنبی اور گھر بھر کی جانیں صرف اس لئے گنوائیں تھیں کہ فقط ان کے ماتم پر قناعت فرمائی جائے اور کسی کو اس کی تقلید کا خیال بھی نہ آئے۔

حسین اعظمی صاحب کی بصارت نے یہ نقطہ پالیا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ رونے والوں کو ہاتھ میں باطل شکن تلوار دے دیں اور ظاہر ہے کہ یہ ایک عظیم اور بے کراں مبارک فریضہ ہے جس کو وہ ادا کر رہے ہیں'' ۳۲

علماء ادب کے مذکورہ بالا تبصرے جناب حسین اعظمی کے ادبی مقام کی تعین کے لئے کافی ہیں ،اب مزید تبصرے کی ضرورت نہیں ہے ۔تاہم جی چاہتا ہے کہ حسین اعظمی کے کلام سے لطف اندوز ہونے کے لئے اس مرثیے کے دو بند مزید پیش کئے جائیں۔

دیں کو بازیچۂ اطفال بنانے والو
کفر سازی کی دکانوں کو سجانے والو
انبیاء کو بھی خطاکار بنانے والو
مجمع عام میں قرآن جلانے والو
دل میں جو کچھ ہے تمہارے وہ کہو اور سنو
بات اب کفر کی چھیڑی ہے تو لو اور سنو
گر تمکن ہو تو پھر ظلم کا سہنا بھی ہے کفر

ظلم کے دھارے پہ مایوسی سے بہنا بھی ہے کفر
ظلم کے دور میں چپ سادھ کے رہنا بھی ہے کفر
ظلم کو کھل کے کبھی ظلم نہ کہنا بھی ہے کفر

ظلم تھک جاتا ہے تو مظلوم نہیں ہارتے ہیں
مرد ظالم کو سردار بھی للکارتے ہیں

انجم اعظمی

اعظم گڑھ نے جن جواہر پاروں کو کھویا ان میں ایک بلند قامت شخصیت انجم اعظمی کی بھی ہے۔ ۲؍جنوری ۱۹۳۱ء کو پیدا ہوئے۔ آپ فرزندان علی گڑھ میں نمایاں مقام رکھتے ہیں، بعد کو کراچی چلے گئے۔ رشید احمد صدیقی سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ آپ ایک سنگ تراش شاعر اور دیدہ ور نقاد ہیں۔ ادب کے بارے میں آپ کا نظریہ بہت سلجھا ہوا ہے۔ علامہ اقبال سہیل کی عظمت کے قائل ہیں، فرماتے ہیں:

''علامہ اقبال سہیل اور رشید احمد صدیقی کی تعلیم و تربیت نے میرے ادبی شعور کو جلا بخشی ہے''۳۳؎

اپنی بات کو دو ٹوک اور بے لاگ طریقے سے پر اعتماد لہجے میں پیش کرنا آپ کا وصف ہے۔ فن کی اہمیت کے متعلق فرماتے ہیں:

''......جب ہم اپنے دل کی واردات بیان کرتے ہیں تو کائنات کی ان دیکھی پہنائیوں میں پھیلی ہوئی زندگی کی تخلیقی قوتیں تمام کی تمام دل کے اضطراب میں درآتی ہیں۔ جس طرح موسم گل میں درختوں میں کونپلیں پھوٹتی ہیں اور شاخوں پر نئے برگ وبار آتے ہیں ویسے ہی دل کے اضطراب میں فن کے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں اور حسن کے وہ پیکر تراشے جاتے ہیں جنہیں فن کا درجہ ملتا ہے اور جو حقیقتاً زندگی کی تازہ کاری کی مثال ہوتے ہیں۔ اس لئے فن کو فلسفہ پر فوقیت حاصل ہے کہ وہ صرف زندگی کا مشاہدہ نہیں کرتا اور نہ کوئی نظام فکر مرتب کرتا ہے جو چاہے کتنا ہی اہم ہو، آئندہ کوئی اور

نظام فکر اس کی جگہ لے لیتا ہے بلکہ صرف زیادہ تر میں مسلسل حسن کی تخلیق اور زندگی کی صورت گری کرتا رہتا ہے۔فن خود زندگی کے لئے زندگی بخش ہے اور زندگی بوسیدہ ہونے سے محفوظ رکھتا ہے۔اس لئے میں اپنے عہد کے لوگوں سے سوال کرتا ہوں کہ فن سے گریز کیوں؟ چاہے مغرب کی کھوکھلی جمہوریت کے علم بردار ہوں یا استحصال کے خلاف جنگ لڑنے والے اگر فن کو اولیت نہ دی گئی تو زندگی کو بوسیدہ ہونے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔'' ۳۴؎

ایک اور موقع پر'' فرد کی پہچان ،شخصیت'' کے زیر عنوان لفظ کی ماہیت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''جس طرح ایک ہی چہرہ چاندنی ،دھوپ، چھاؤں،اجالے اور اندھیرے میں مختلف نظر آتا ہے اسی طرح سیاق وسباق بدل جانے لفظ کے معنی میں لطیف فرق پیدا ہو جاتا ہے۔گویا لفظ ایک جگہ ٹہرا ہوا نہیں ہوتا بلکہ معنی کے دائرے میں اپنی گردش مکمل کرتا ہے اور یہ دائرہ اس کے سارے سیاق وسباق سے مل کر بنتا ہے۔اسی طرح ہر لفظ ایک نظام شمسی کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔'' ۳۵؎

ادب اور حقیقت کے علاوہ انجم اعظمی کی دیگر کتابیں یہ ہیں ۔لب ورخسار،لہو کے چراغ، چہرہ، زیرآسماں (شعری مجموعے)،شاعری کی زباں ،جدید اردو لٹریچر، اعلیٰ تعلیم کے مسائل (علمی وتنقیدی کتاب)۔''چہرہ'' پرآپ کوآدم جی ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔۳۱رجنوری ۱۹۹۰ء کوآپ کا انتقال ہوا۔

احتشام حسین کے بارے میں اجمالی طور پراتنی وضاحت ناگزیر ہے کہ انہیں عام طور پر صرف ایک نقاد یا زیادہ سے زیادہ ایک افسانہ نگار(وہ بھی ابتدائی دور میں) کی حیثیت سے اردو داں طبقہ جانتا ہے۔حالانکہ آپ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔لیکن ان کی شاعری کے ستارے ان کی آفتاب تنقید کی روشنی میں کھو گئے ۔ یہاں کسی تبصرے کے بغیر ان کے کچھ اشعار درج کئے جاتے ہیں:

ہزار رنگ میں غزلیں کہیں مگر اے دوست

تری نگاہ کا پیرایۂ بیاں نہ ملا
آشفتگی بڑھے تو بڑھے لیکن اے ندیم
ہو ساری رات زلف شکن در شکن کی بات

افق سے رنگ کئی پھوٹ کر زمیں پر گرے
ابھی اڑا تھا میری چشم آرزو سے غبار
انہیں کو وقت نے سونپی ہے آج راہبری
کہ جن کے نقش قدم سے ہیں راستے بیزار

سید افتخار حسین

اعظم گڑھ کے تقریباً سبھی بڑے شعراء چھوٹے اور غیر معروف گاؤں میں پیدا ہوئے۔انہیں شعراء میں ایک نام افتخار اعظمی کا ہے۔وہ ایک قادرالکلام شاعر تھے۔آپ کا نام سید افتخار حسین ہے۔ آپ کا موضع پتلاغوث پور ہے۔۱۹۳۵ء میں اپنے نانہال املی پور میں پیدا ہوئے۔

افتخار اعظمی بھی ان سینکڑوں ادیبوں کی طرح ہیں جو کہ مذہبی گھرانوں سے تعلق رکھنے کے باوجود مذہب سے دور ہوگئے۔یہ دراصل ابتدائی تربیت کے فقدان کا نتیجہ ہے۔حالانکہ علماء دین کا کہنا ہے کہ بنیادی طور پر روحانی تعلیم کی کمی کا نتیجہ ارتداد کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے،جب کہ اسلام مادیت اور روحانیت دونوں کا سنگم ہے۔لیکن ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ لوگ کمیونزم میں روحانیت کی تلاش میں شامل ہوئے۔ایسا نہیں ہے۔بات دراصل یہ ہے کہ کمیونزم نے عدل ومساوات،غلام اور مزدور،امیر وغریب،ظالم ومظلوم،اور محنت کش وسرمایہ دار طبقوں کے فرق کو ختم کرنے کے لئے جو مساوات کا نظریہ پیش کیا یہ ایک ذہین،ترقی پسند اور روشن خیال طبقے کی کشش کا باعث بنا۔اسلام کے علم برداروں نے انیسویں صدی کے آخر میں جب کمیونزم کا زور بڑھ رہا تھا بلکہ اب تک اسلام کی مساوات کا وہ رخ نہیں پیش کیا،جس کے ذریعے اسلام کے زمانۂ آغاز میں غیر مسلم اسلام میں قلعۂ پناہ اور جائے عدل ومساوات سمجھ کر جوق در جوق داخل ہورہے تھے۔اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہمارے مولویوں کی یہ خود

غرض اور بے عمل جماعت نے اپنے حسن اخلاق اور طرز انصاف سے غیروں کو تو کیا متوجہ کرتی خود اپنوں سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ اسلام نے مزدوروں کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے اجرت ادا کر دینے کا حکم دیا۔ فتح بیت المقدس کے وقت امیر المؤمنین اونٹ کی رسی تھامے ہوئے ہے اور غلام اونٹ کی پیٹھ پر سوار ہے۔ بادشاہ عرب غریب دودھ بیچنے والے کی ایماندار بیٹی کو شہزادۂ عرب کے نکاح میں قبول کر لیتا ہے۔ ارتکاب گناہ پر اپنے لخت جگر کو اپنی نظروں کے سامنے سو کوڑے لگاتا ہے اور اس کو دم توڑتے ہوئے دیکھتا ہے۔ لیکن اولاد کی محبت جادۂ انصاف سے اس کے قدم نہیں ہلا سکی۔ اور کوڑے کھاتے کھاتے جب بیٹے کی روح پرواز کر جاتی ہے تو لاش کو اپنی آغوش میں لے کر اشک آلود مسرت سے کہتا ہے کہ اے میرے بیٹے تو نے حق پر جان دی ہے۔ جب تک مسلمانوں کا معاشرہ ان صفات سے متصف تھا اسلام کا حلقہ وسیع ہوتا گیا اور ان خصوصیات میں جب کمی آئی تو نتیجہ وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔

افتخار اعظمی کا ابتدائی کلام بتاتا ہے کہ انہیں اسلام کے اس نظام مساوات نے متأثر کیا۔ وہ اسلامی تعلیم ہی کی طرح انسانوں کے خانوں میں بانٹنے کے خلاف تھے۔ اسلامی تعلیم ہی کی طرح وطن پرسی اور جغرافیائی سرحدوں سے بیزار تھے۔ لیکن بدقسمتی سے انہیں یہ نور مدرسوں اور خانقاہوں میں نہ ملا۔ یہ نور تھا تو ان کا اپنا، لیکن انہیں یہ کمیونزم کے پرچم تلے نصیب ہوا۔ چنانچہ ان کی پہلی نظم جو انہوں نے ۱۹۵۷ء میں کہی تھی اس سے مذکورہ بالا دعوے کی تصدیق ہوتی ہے۔ یہ نظم ہے:

ہر ایک گلشن ہمارا گلشن — ہر ایک کلی کو ہے چاہ اپنی
ہر ایک گل سے ہمیں محبت — ہر ایک دل میں ہے راہ اپنی

نشان جتنے ہیں سرحدوں کے مٹا رہا ہے قلم ہمارا
تمام عالم وطن ہمارا - عرب ہمارا عجم ہمارا

آخری مصرعہ گویا اس مصرعے کا ترجمہ ہے جو اسلام صدیوں پہلے کہہ چکا ہے۔

ہر ملک ملک است کہ ملک خدائے است

افتخار اعظمی نے غزل اور نظم دونوں میدانوں میں گھوڑے دوڑائے ہیں اور دونوں میں ایک

چابک دست شہسوار کی طرح فاتح و کامراں رہے ہیں۔لیکن میرے خیال میں نظموں میں ان کا جوہر کچھ زیادہ ہی نکھر کر سامنے آیا ہے۔ایسا لگتا ہے کہ اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کے لئے انہوں نے نظموں کا وسیلہ تلاش کیا ہے۔وہ ابہام سے زیادہ توضیح کے قائل تو نظر آتے ہیں لیکن اجمال میں یقین رکھتے ہیں اوران کا یہ اجمال رشک تفصیل ہے۔غالباوہ اپنے قاری کو اتنے سطحی ذہن کا نہیں سمجھتے۔علی سجاد ظہیر کی وفات پر جونظم کہی ہے اس میں درد وکرب پورے خلوص کے ساتھ موجود ہے۔لیکن بین و ماتم اور لالہ وشیون کا شائبہ تک نہیں ہے۔نظم پیش ہے:

کون بچھڑا سر بازار تمنا ہم سے
سرنگوں صبر اجل
دست مسیحا چپ ہے
خشک ہیں چشم و چمن کے آنسو
شعلۂ رنگ حنا ہے خاموش
آہ! افلاک سے ٹکرا کے پلٹ آتی ہے
بند ہے باب اثر
دست دعا ہے خاموش
آج وہ گوہر نایاب ملا ہے اس کو
کاسۂ دست زمیں
جگمگاتا ہے ستارے کی طرح
دست قدرت کی عطا پر دل دنیا خاموش

اختر مسلمی

اعظم گڑھ کے کہنہ مشق شعراء میں اختر مسلمی کو فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔آپ اپنی خوش الحانی سے مشاعرہ لوٹ لیتے تھے۔آپ کی شرکت مشاعروں کی کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی تھی۔آخر عمر تک

اشعار میں رومانویت اور رنگین مزاجی موجود تھی ۔حالانکہ مشرع اور پرہیز گار شخص تھے۔لیکن غزلوں میں شوخی بدرجۂ اتم موجود تھی۔آپ کو اقبال سہیل سے شرف تلمذ حاصل تھا۔آپ پر علامہ اقبال سہیل کے کلام کے سرقے کا الزام بھی عائد کیا جاتا ہے۔لیکن آپ کے دونوں مجموعۂ کلام ''موج صبا'' اور ''موج نسیم'' کے مطالعے سے اس دعوے کی تصدیق نہیں ہوتی۔

سہیل صاحب اور اختر صاحب کے لہجے ہی نہیں موضوعات تک مختلف ہیں۔اقبال سہیل کے کلام سے تو اہل نظر واقف ہیں۔اختر مسلمی کے فن کا جائزہ لینے کے لئے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

دل کے انداز تحمل پہ صدا جھوم اٹھی
دیکھ کر حوصلہ ٔ ضبط جفا جھوم اٹھی

آج بسمل کی اداؤں پہ قضا جھوم اٹھی
وہ تماشائے فنا تھا کہ بقا جھوم اٹھی

لذت درد ملی ہے جرم محبت میں اسے
وہ سزا پائی ہے دل نے کہ خطا جھوم اٹھی

چشم میگوں جو اٹھی ہے تو چھلکنے لگے جام
زلف شب رنگ جو بکھری تو گھٹا جھوم اٹھی

عالم وجد ہے ماحول پہ طاری اختر
وہ غزل تم نے سنائی کہ فضا جھوم اٹھی

علی جواد زیدی

شعرائے اعظم گڑھ میں علی جواد زیدی نہایت مشہور ومعروف شخصیت کا نام ہے۔آپ اعظم گڑھ کے ایک مشہور گاؤں کرہان میں تولد پذیر ہوئے۔آپ کے علم وفضل اور شخصیت وخدمات پر ڈاکٹر خلیق انجم اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

''ایک شاعر،ایک ادیب،ایک محقق،دارورسن کی آزمائش سے گزرا ہوا ایک سیاست

داں اور اعلیٰ عہدے پر فائز ایک سرکاری افسر۔ ان تمام شخصیتوں کے مجموعے کا نام علی جواد زیدی ہے۔ شخصیتیں مضبوط آہنی خانوں میں اس طرح بٹی ہوئی ہیں کہ نمایاں طور پر کبھی ایک دوسرے کو متاثر کرتی نظر نہیں آتیں''۔۳۶؎

آپ دو درجن سے زائد تصانیف اور بے شمار مضامین کے مصنف ہیں ۔آپ کا تعارف کرانا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ یہاں آپ کا ذکر نہیں بلکہ آپ کے خاندان کا اجمالی تذکرہ مقصود ہے۔ کئی پشتوں سے آپ کے اسلاف علم و ادب اور عہدوں اور اعزازات کے حامل رہے ہیں۔ آپ کے پردادا سید محمود جواد فارسی کے اچھے شاعر تھے، آپ تحصیل دار تھے، بڑے فرزند سید علی حماد تھے جو ڈپٹی کلکٹر تھے۔ ان کے خسر سید علی نقی ایک پائے کے عالم تھے۔ آپ کی تصنیف ''تقدیم النقی'' جیوتش کے طریقے سے جنم پتری تیار کرنے کی تشریح پر اردو میں پہلی کتاب تھی۔ زیدی صاحب کے والد سید علی افسر اردو کے ایک اچھے شاعر تھے، فارسی و عربی میں مہارت رکھتے تھے۔ آپ کے متعلق زیدی صاحب لکھتے ہیں کہ رنگوں کی آمیزش اور خطوط کے استحکام پر تجربہ کار مصوروں سے داد وصول کرتے تھے۔ افسر صاحب کے بڑے بھائی سید حسن امداد بے حد ذہین تھے۔ تحصیل دار تھے۔ ان سے منجھلے بھائی سید زین العابدین اچھے نثر نگار تھے۔ زیدی صاحب کے ایک چچا زاد بھائی سید حسن ارشاد جج تھے۔ انگریزی، فارسی اور اردو زبان و ادب کا صاف ستھرا ذوق رکھتے تھے۔ آپ شعر بھی کہتے تھے۔ ایک اور چچا زاد بھائی سید علی اصفاد عربی کے فارغ التحصیل تھے۔ زیدی صاحب کے پرنانا سید باقر حسین اردو کے صاحب دیوان شاعر تھے۔ انہوں نے فسانۂ عجائب کا مثنوی کی شکل میں ترجمہ کیا تھا، زیدی صاحب کے نانا سید محمد جعفر بھی شاعر تھے۔ نعت اور منقبت کہنے میں ملکہ حاصل تھا۔ جعفر مرحوم کے دو لڑکے تھے۔ سید احمد علی احمد اور سید محمد رسا۔ دونوں اردو میں شعر کہتے تھے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ علی جواد زیدی صاحب کے خاندان کا ہر فرد آفتاب و ماہتاب ہے۔

ناطق اعظمی

اعظم گڑھ میں گیسوئے غزل کی شانہ کشی جن شعراء کی مرہون منت ہے ان میں ناطق اعظمی بہت

بلند مرتبے کے مالک ہیں۔آپ ۱۹۳۶ء میں اعظم گڑھ کے ایک چھوٹے سے گاؤں موضع نرئی پور میں پیدا ہوئے۔زمیں دار گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔بچپن سے نوجوانی تک کا زمانہ خوش حالی و فارغ البالی میں گزارا۔لیکن شباب تنگیٔ معاش کا عذاب لے کر آیا۔۱۹۵۲ء میں زمیں داری ٹوٹ چکی تھی۔لہٰذا مسائل زندگی دامن گیر ہوئے ،جو اس زمانے میں تقریباً تمام شعراء کا مقدر بنے۔ان اعصاب شکن حالات میں بھی آپ نے ہمت نہیں ہاری اور جد و جہد اور عزم و عمل کے تیشے سے افلاس کی سنگلاخ اور بنجر زمیں کو خیاباں میں تبدیل کر دیا۔آپ ہومیو پیتھک پریکٹس کی طرف رجوع ہوئے۔اللہ نے بہت جلد عزت بخشی اور ان کا شمار ضلع کے مشہور ہومیو پیتھ میں ہونے لگا۔آپ اپنے فکر و فن کی بدولت بہت جلد اساتذہ سخن کی چشم التفات کا مرکز بن گئے۔علامہ آرز ولکھنوی نے مشہور استاذ شاعر احسن رضوی سے مشورۂ سخن لینے کی ہدایت فرمائی،۱۹۵۸ء میں آپ کا پہلا مجموعہ کلام ''داغ دل'' کے نام سے شائع ہوا۔ جو حلقۂ ادب میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔دوسرے مجموعۂ کلام ''غبار رہگذار'' کی رسم اجراء ۱۹۹۸ء میں عمل میں آئی۔

آپ کے کلام میں روایت اور جدت کا خوشگوار امتزاج پایا جاتا ہے۔جوش وولولہ کے ساتھ بیساختگی اور بے باکی تقریباً ہر غزل میں نمایاں ہے۔چند اشعار پیش ہیں:

کتنے سورج خواب میں ڈھلتے رہے
رات بھر ہم دھوپ میں جلتے رہے
ایک زندہ لاش کی مانند ہم
خود ہی اپنے دوش پر کھلتے رہے

....

شکست خوردہ ''انا'' کے غلام سب ہی تھے
صفوں میں ہوتے کھڑے کیا امام سب ہی تھے
ہوس کے گیسوئے پیچاں سے کوئی بچ نہ سکا

فقیر ہو کہ غنی زیر دام سب ہی تھے
پڑا جو رن تو سپر سونپ دی غنیموں کو
گھروں میں اپنے مگر بے نیام سب ہی تھے
شاہد ماہلی

اعظم گڑھ میں جدیدیت سے متأثر شعراء کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ان میں ایک نمایاں نام شاہد ماہلی کا ہے۔آپ ۱۹۴۳ء میں پروفیسر سید احتشام حسین کے مولد قصبہ ماہل میں پیدا ہوئے تھے۔ادب سے فطری وابستگی ہے۔نہایت سنجیدگی سے تصنیف وتالیف میں مصروف رہے ہیں۔آپ غالب اکیڈمی دہلی سے وابستہ تھے۔آپ کی کئی کتابیں زیور طبع سے مرصع ہو چکی ہیں۔مثلاً کیفی اعظمی عکس اور جہتیں ، پاکستانی ادب اور کلچر کا مسئلہ، نئی نظم نئے دستخط ، اور منظر پس منظر وغیرہ۔بغیر کسی تبصرہ کے شاہد صاحب کی ایک نظم درج ہے:

''اندیشہ''

دور تک الفاظ کا پھیلا ہے شہر
چار سو مفہوم و معنی کے مکاں
شاہراہیں ہیں خیال وفکر کی
علم وفن کی جگمگاتی روشنی
گوشۂ فہم وشعور

ہے یہ اندیشہ
کسی دن پھٹ نہ جائے
میرے سینے کا کوئی آتش فشاں
مختصر اعظمی

سر زمیں اعظم گڑھ سنجیدہ شاعری کے لئے تو نہایت زرخیز رہی ہے۔لیکن طنزیہ ومزاحیہ شاعری

کی پیداوار میں اس نے بخل سے کام لیا۔ البتہ جن چند گنے چنے شعراء نے ان مساعد حالات میں دوشیزۂ اردو کے افسردہ لبوں پر غنچہ ہائے تبسم کھلانے کے لئے خود کو وقف کیا۔ ان میں ایک معتبر نام مختصر اعظمی کا ہے۔ آپ اعظم گڑھ ضلع کے ایک گاؤں کنورہ گھنی میں ۱۹۳۹ء میں پیدا ہوئے۔ وہبی شاعر بلکہ وہابی شاعر ہیں۔ پہلا مجموعۂ کلام ''القصہ مختصر'' ۱۹۹۵ء میں شائع ہوکر خراج تحسین خاص وعام حاصل کر چکا ہے

۔

آپ کا شعری مسلک ادب برائے ادب نہیں، ادب برائے زندگی بلکہ ادب برائے بندگی ہے۔ آپ نے سیاست ومعاشرت کے ساتھ ساتھ مذہب کی شعبدہ بازیوں پر بھی تنقید کی ہے۔ آپ زیادہ تر پیغام کے شاعر ہیں۔ مزاحیہ شاعر کے کلام سے زیادہ تر سامعین وقارئین مسکراہٹوں اور قہقہوں میں ڈوب جاتے ہیں۔ اس لئے اس کو بڑی مشکل درپیش ہوتی ہے کہ وہ کس طرح بیک وقت پیغام اور خندہ لبی دونوں فراہم کرے۔ کبھی ایک چیز غالب ہوجاتی ہے کبھی دوسری۔ خوشی کی بات ہے کہ مختصر صاحب نے پیغام کو اولیت دی ہے۔ لیکن اس سے یہ نقصان ضرور ہوا ہے کہ جہاں پیغام غالب ہے وہاں مزاج کی چاشنی کم ہوگئی ہے۔ آپ کا مجموعۂ کلام پڑھنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نظریاتی طور پر جماعت اسلامی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک خیال یہ ہے کہ شاعر کو کسی پارٹی یا جماعت سے منسلک نہیں ہونا چاہئے اس سے آفاقی قدریں مجروح ہوتی ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ادب اکثر وبیشتر کسی نظریے کا پابند ہوتا ہے۔ کارل مارکس، لینن، نیٹشے اور گوئٹے وغیرہ کے مقلدین کو ادب میں مقام حاصل ہوسکتا ہے تو کوئی ابوالاعلیٰ مودودی کے نظریات سے متاثر شخص کے لئے دشت ادب کی سیاحی حرام کیوں قرار دی جائے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ کسی نظریے کی تائید وتردید ادبی دائرے میں ہی ہونی چاہئے۔ شکر ہے کہ مختصر صاحب کہیں ادبی تقاضوں سے غافل نہیں رہے۔ ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی نے بڑے پتے کی بات کہی ہے:

> **''......وہ (مختصر اعظمی) ایک صحت مند نظریۂ حیات کے حامل ہیں اور کسی نظریۂ حیات کو صحیح سمجھ لینے کے بعد اس سے چمٹا رہنے والا شخص اس شخص سے کہیں بہتر پوشاک کی طرح نئے نئے نظریے بدلتا رہتا ہے اور نئے جنم کی تمنا میں خودکشی کرنے سے باز نہیں**

رہتا۔''[۳۷]

آپ کی ادبی خدمات پر'' حلقۂ شعر وادب'' ممبئی نے آپ کو'' علامہ مختصر اعظمی'' کے باوقار خطاب سے نوازا۔ آپ کے شعری معیار کا اندازہ لگانے کے لئے آپ کی ایک نظم درج ذیل ہے۔

'' مہاتما گاندھی کی بھارت یاترا ۱۹۷۶ء میں''

گاندھی نے ایک روز یہ بھگوان سے کہا
آدیش چاہئے مجھے جاؤں گا انڈیا
آرڈر ہوا کہ جاؤ مگر اتنا سوچ لو
ایسا نہ ہو کہ جاتے ہی '' ستیہ گرہ'' کرو
بس صرف ایک دن کی اجازت ہے جاؤ تم
لیکن نہ کچھ عوام کو دنیا '' سجھاؤ'' تم
بابو کو آسمان سے کچھ اوتار لے چلے
با احترام جانب سنسار لے چلے
کچھ اور تیز گردش ایام ہوگئی
دہلی تک آتے آتے مگر شام ہوگئی
باپو کے دل میں کیا تھا کوئی جانتا نہ تھا
پوچھا کہ گرم کیوں یہ عوامی مزاج ہے
اک شخص بولا فرقہ پرستوں کا راج ہے
باپو سے پھر وہ بولا کہ'' خود کو بچاؤ تم''
نسبندی ہورہی ہے میاں بھاگ جاؤ تم
باپو کھڑے رہے کسی سوچ اور بچار میں
آخر پکڑ لئے گئے ڈی، آئی، آر میں

رشید انصاری

اعظم گڑھ کے شعراء میں رشید انصاری بڑے معتبر مقام کے مالک تھے۔آپ کو اعظم گڑھ میں کلاسیکی شاعری کی آبرو کہا جائے تو بے جانہ ہوگا۔نہایت حساس طبیعت پائی تھی۔حالانکہ مشاعروں میں تحت اللفظ میں کلام پڑھتے تھے۔لیکن کلام کی موسیقیت کے سحر اور نغمگی کے جادو سے نوجوانوں پر حال اور ضعیفوں پر ماضی طاری ہوجاتا تھا۔آپ نے سرائے میر (اعظم گڑھ) کے نئے شعراء کی تربیت بڑی شفقت کے ساتھ فرمائی۔کچھ سال پہلے آپ کا انتقال ہو چکا ہے۔نمونۂ کلام یہ ہے:

باہنوں کی قید زلفوں کی زنجیر مل گئی
میرے جنوں کو خوابوں کی تعبیر مل گئی

کب سے بھٹک رہا تھا میں صحراء کی دھوپ میں
تم کیا ملے کہ وادیٔ کشمیر مل گئی

گونجے گی میکدے میں میری نرگسی غزل
میزوں پہ ساغروں کی کھنک چھوڑ جاؤں گا

کاغذ میرے قلم کی گواہی میں آئے گا
یہ شہر یہ زمیں یہ فلک چھوڑ جاؤں گا

ڈاکٹر ساغر اعظمی

اعظم گڑھ کے شعراء میں ڈاکٹر ساغر اعظمی کا نام بھی قابل ذکر ہے۔مشاعروں کے حوالے سے ملک اور بیرون ملک دونوں جگہوں پر اردو داں طبقہ آپ سے واقف ہے۔نہایت خوش الحان تھے۔جب غزل سرا ہوتے تھے تو اہل محفل ان کے ترنم کے سحر میں کھو جاتے تھے۔ابتدائی شاعری میں حسن وعشق کی چاشنی ملتی ہے۔لیکن جلد ہی آپ نے اس فضا کو خیر باد کہا اور گیسوئے جاناں سے نکل کر اسیر کاکل دوراں ہو گئے۔آپ کی غزلوں میں حالات کی آنچ اور نرم ونازک لہجے کی خوش گوار آمیزش ہے۔آپ کے اشعار میں فلسفیت داخل ہے۔فلسفیانہ شاعری اگر لہجے کی لطافت اور اسلوب کی نزاکت کے سائے میں

چلتی ہےتو اثر انگیز ہوتی ہے۔ ورنہ خشک اور بے مزہ ہو جاتی ہے۔ رومانی شاعری سے انقلابی شاعری تک آپ نے فنی مہارت اور لہجے کی شگفتگی برقرار رکھی ہے۔ فلسفیانہ شاعری میں بھی وہ کسی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔ چند اشعار پیش کیئے جاتے ہیں:

کون کہتا ہے محبت کے لئے ہوتے ہیں
اب تو رشتے بھی ضرورت کے لئے ہوتے ہیں
آ کے بونے میری بستی میں بسے ہیں جب سے
روز جھگڑے قد و قامت کے لئے ہوتے ہیں
قاتلو تم بھی ذرا جا کے سجاؤ مقتل
ہم بھی تیار شہادت کے لئے ہوتے ہیں
خون جب دے کے بھی قیمت نہ پسینے کی ملی
ایسے حالات بغاوت کے لئے ہوتے ہیں

....

گلشن کو بہاروں نے اس طرح نوازا ہے
ہر شاخ کے کاندھوں پر کلیوں کا جنازہ ہے
یہ راکھ مکانوں کی ضائع نہ کرو ساغر
یہ اہل سیاست کے رخسار کا غازہ ہے

ماہر انصاری

ماہر انصاری اعظمی بھی شعرائے اعظم گڑھ میں قابل ذکر ہیں۔ اپنی فکر کو پیرایۂ اظہار عطا کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ الفاظ کے مزاج سے واقف ہیں۔ زمانے کی ستم طرازی اور حالات کی سنگینی نے برملا اظہار پر پابندی لگا دی ہے۔ لیکن نام لئے بغیر ذکر کرنے سے باز نہیں آتے۔ رنج والم میں مسکرانے کا فن اور بے سروسامانی میں جینے کی ادا بانٹ رہے ہیں:

محرم عیش حیات گذراں میں ہم لوگ
فیض یاب نگہ پیر مغاں ہیں ہم لوگ
کیا کہیں مصلحت وقت نے پکڑی ہے زباں
ورنہ اے دوست بڑے شوخ بیاں ہیں ہم لوگ
ظلمت غم سے نہ گھبر ائیں زمانے والے
جلوہ صبح مسرت کا نشاں ہیں ہم لوگ
کتنے غم گیسوئے جاناں میں ہیں ہم سے پوچھو
رازدان شکن زلف بتاں ہیں ہم لوگ
ہم سے سیکھے کوئی جینے کا سلیقہ ماہر
بزم آلام میں بھی زمزمہ خواں ہیں ہم لوگ

نشاط سیمابی اعظمی

نشاط سیمابی اعظمی اعظم گڑھ کی مٹتی ہوئی شعری تہذیب کا سرمایہ ہیں ۔شاعری آپ کی فطرت ثانیہ بن گئی ہے۔فطری ذوق اوراس پرعلامہ سیماب اکبرآبادی کے دست تربیت نے آپ کوکہیں سے کہیں پہنچادیا۔ایک ایک شعر سے استادانہ رنگ ظاہر ہے۔آپ ایک باخبر ہی نہیں بانظر شاعر بھی ہیں ۔فکران کےفن کی آنچ میں تپ کرکندن بن گئی ہے۔فرسودہ سےفرسودہ مضمون آپ کی نسیم فن سے شگفتہ ہوگئے ہیں۔آپ نے دردوغم اوررنج والم حیات کی اپنے اشعار سے وہ پذیرائی کی کہ وہ رشک صدمسرت بن گئے ۔آپ نے فریب ہستی کھا کرخودزندگی کوفریب دیااور جب زندگی کواس بات کا احساس ہواتو آپ اس کے دست رسا سے دور ہو چکے تھے۔ایک غزل درج ہے:

آپ سنئے یا نہ سنئے داستان آرزو
اشک غم خود ہی بنیں گے ترجمان آرزو

عہد پیری کس کو کہتے ہیں کسے دور شباب
اک بہار آرزو ہے اک خزانِ آرزو
اک ذرا کچھ آپ فرمائیں تو یاد آئے مجھے
میں بھلا بیٹھا ہوں اپنی داستانِ آرزو
لوٹ آ اے عمر رفتہ تھم ذرا دستِ اجل
کتنی دلکش ہے بہارِ گلستانِ آرزو
خود فراموشی کا اپنا اب یہ عالم ہے نشاط
نام کو دل نہیں باقی نشانِ آرزو

غنی اعظمی

شعرائے اعظم گڑھ میں غنی اعظمی ایک ہونہار اور بیباک شاعر ہیں۔غزلوں میں خودآ گہی اور زمانے سے بے نیازی کی شان جھلکتی ہے۔کارخانۂ عالم میں اپنے وجود کا احساس اور اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کی ادائیگی کا سبق اور حوصلہ آپ کے کلام کی بنیادی خصوصیت ہیں۔ایک غزل درج ہے:

ہر بوند میں رقصاں ہے کوئی شعلۂ ایام
پیمانے کی یہ آتش غم میرے لئے ہے

ہے گرم مرے دم سے نوا خانۂ ہستی
یہ زمزمۂ لوح و قلم میرے لئے ہے

ہر فتنۂ ایام کو اک ربط ہے مجھ سے
ابرو کی شکن زلف کا خم میرے لئے ہے

خاموش نہیں ساز ابھی دارورسن کا
ہر دور میں پیغام میرے لئے ہے

مارا ہوں غنی ذوق پریشان نظری کا
آشفتگئ زلف صنم میرے لئے ہے

فراز مبارک پوری

اعظم گڑھ کا نام روشن کرنے والے شعراء میں فراز مبارکپوری کا نام ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔آپ نے گیسوئے غزل کی شانہ کشی میں جوانی گزار دی اور اب ڈھلتے ہوئے شباب میں بھی اس سے یوں الجھے ہوئے ہیں کہ ناخن قضا ہی اس کی گرہ کشائی کرسکتا ہے۔آپ کے کلام میں حسن وعشق کے فرسودہ تصورات کو کوئی مقام نہیں مل سکا۔حالات وواقعات پر گہری نظر ہے۔چند متفرق اشعار درج ذیل ہیں:

کتنے ہونٹوں سے تراشی ہے تبسم کی کرن
تب سجایا ہے کسی ایک نے کاشانے کو

ایک ایک سے ہجوم میں یہ پوچھتا ہوں میں
میرا پتا بتاؤ کہاں کھوگیا ہوں میں

افکار کی دلہن کو اڑھالو ردائے فن
اتنا بھی جوش کیا کہ کھلے سر ہی لے چلیں

تہذیب لوٹ آئی ہے پتھر کے دور کی
بس اتنا فرق ہے کہ نئے پیرہن میں ہے

رام کمار فہیم

رام کمار فہیم اعظمی اچھے شاعر ہیں اور مشہور شاعر بسمل الہ آبادی کے ہونہار تلامذہ میں ہیں۔فطری

ذوق شعری اور اس پر قادر الکلام استاذ کی اصلاح وتربیت نے آپ کے کلام کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔ آپ کا کلام فلکر وفن کا بہترین مرقع ہے۔ ایک غزل پیش ہے:

لبوں سے آہ نکلے اشک آنکھوں سے رواں کیوں ہو
محبت ضبط کی خوگر ہے راز دل عیاں کیوں ہو
الگ ہے آسماں سے اس کا انداز ستم گاری
زمیں کوئے قاتل ہم سواد آسماں کیوں ہو
ترے دیدار سے تو جان ودل کی شمع روشن ہے
ترے چہرے سے میرا رنگ بیتابی عیاں کیوں ہو
فہیم خوش بیاں بھی شیفتہ ہے طرز غالب کا
جہاں شعر میں غالب سا کوئی نکتہ داں کیو ں ہو

اعظم گڑھ کے جن گنے چنے طنز ومزاح کے شعراء نے ادبی حلقوں میں اپنی حیثیت منوائی ہے ان میں ماہر محمد آبادی کا نام نمایاں ہے۔ آپ نے اپنی مزاحیہ شاعری سے مغموم عوام کے ہونٹوں پر مسرت وشادمانی کے پھول کھلائے تھے۔ اور اپنے طنز کے نشتر سے سماج کے فاسد زخموں کا آپریشن بھی کیا۔ آپ مشاعروں میں بڑی عزت اور شوق سے سنے جاتے تھے۔ دہلی، ممبئی اور اتر پردیش کے مشاعرے آپ کی شرکت کے بغیر بہت خشک اور پھیکے تصور کئے جاتے تھے۔ آپ کی ایک نظم ''ڈاکٹر'' کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

ہیں بہت مشہور میرے شہر میں اک ڈاکٹر
مدح میں کالے ہیں ان کی گھر کے گھر دیوار ودر
اتفاقا جب کوئی بیمار ملتا ہے انہیں
جیسے منی آرڈر بذریعہ تار ملتا ہے انہیں
دیکھتے ہیں اتنی اچھی طرح بیماروں کی نبض

جیسے ملک الموت کرتے ہیں کسی کی روح قبض
جو دوا لینے گیا وہ خیر سے آیا نہیں
لائے کندھوں پر اٹھا کر پیر سے آیا نہیں
بد نصیبی سے اگر سینے پر آلہ گر پڑا
بند کر دیتا ہے فوراً اپنی حرکت پھیپھڑا
کل ہی ڈالی تھی دوا شاید کسی کی ناک میں
آج سنتے ہیں کہ وہ آرام سے ہے خاک میں

حضرت نوح ناروی کے شاگرد خاص برقؔ اعظمی اعظم گڑھ کی باغ و بہار شخصیت تھے۔ شہر میں ان کے دم سے بڑی رونق تھی۔ شہر میں آئے دن کہیں نہ کہیں شعروشاعری کی محفل برپا کرتے رہتے تھے شاعر ہی نہیں شاعر گر بھی تھے، آپ کے شاگردوں کی اچھی خاصی تعداد تھی۔ یہاں تک کہ آپ کے تلامذہ پر مشتمل ایک ایسی جماعت سرگرم اور فعال تھی کہ شہر میں ''برقی گروپ'' کے نام سے مشہور تھی۔ آپ کے کلام میں استادانہ پختگی اور اعتماد جگہ جگہ نمایاں ہے۔ ایک غزل کے چند شعر پیش ہیں:

آتی ہے ان کی یاد غزل کہہ رہا ہوں میں
اے عشق زندہ آباد غزل کہہ رہا ہوں میں
زحمت شاعروں کی اٹھائے میری بلا
وہ دے رہے ہیں داد غزل کہہ رہا ہوں میں
روح عروض جھوم رہی ہے بصد خوشی
فن کر رہا ہے صاد غزل کہہ رہا ہوں میں
واللہ تیرے عشق میں اے جان آرزو
ہر غم سے دل ہے شاد غزل کہہ رہا ہوں میں

سیفی الاعظمی کہنہ مشق شاعر ہیں۔ روایتی طرز کی غزلیں کہتے ہیں۔ لیکن ان میں کچھ ندرت

ضرور ہوتی ہے۔علامہ کیفی چریا کوٹی کے شاگرد ہیں۔روزنامہ ''بانگ مشرق'' کے ایڈیٹر بھی رہ چکے ہیں جو مئو سے نکلتا ہے۔آپ کی ایک غزل درج ہے:

فصل گل کے منتظر برسوں جو ویرانے رہے
جانے کن حالات سے دوچار دیوانے رہے
وہ جو اپنی انجمن میں ہم سے بیگانے رہے
عافیت ہم نے بھی سمجھی بن کے انجانے رہے
نوچ لی دیوانگی نے چاند کے رخ سے نقاب
چوں چرا کے فلسفے میں غرق فرزانے رہے
بے نیاز آستاں جب تک تھے سجدوں کے ضمیر
مطمئن کعبہ رہا مضطر صنم خانے رہے

سرزمین اعظم گڑھ نے جن خوددار،شہرت بیزار،اور نام ونمود سے بے پرواہ ہستیوں کو جنم دیا ان میں ایک ناقابل فراموش شخصیت اعظم کرہانی کی ہے۔آپ کو آرزو لکھنوی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔آپ مشہور ترقی پسند شاعر شمیم کرہانی کے بڑے بھائی تھے۔آپ کی شاعری پر جتنا فخر کیا جائے کم ہے۔آپ ایک اعلیٰ درجہ کے مفکر و دانشور تھے۔آپ کی غزلوں کا نمایاں اور انفرادی وصف یہ ہے کہ فکر بلند اور خیال عمیق بھی کبھی تغزل کی راہ میں حائل نہیں ہوا۔آپ نے غزل کی تنگ دامانی کا شکوہ کرنے والوں کو دکھا دیا کہ غزل ایک بحر بیکراں ہے اور بقدر ظرف ہر شخص مستفید ہوسکتا ہے۔آپ نے ۱۹۲۹ء میں لکھنؤ سے ایک ادبی ماہنامہ ''ادب'' نکالا۔اس کے علاوہ آپ روزنامہ ''سرفراز'' اور ہفتہ وار ''روشنی'' کے بھی ایڈیٹر رہے۔آپ کی ایک غزل کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

بشر یہ سر وجود عالم اسی جہت سے عیاں نہیں ہے
کہ ابن آدم طلسم ہستی کا راز ہے راز داں نہیں ہے
یہاں تڑپتی ہے روح آدم،سکوں خاطر یہاں نہیں ہے

مقام سعی وعمل سے دنیا نشاط گاہ جناں نہیں ہے
منارہ روشنی بنے گی ہر اک نئے راہرو کی خاطر
جو کام آجائے جستجو میں وہ زندگی رائیگاں نہیں ہے
غبار طبع ملول ہستی نہ چھو سکا خاک پا کو اس کی
جہاں میں ذہن بلند جس کا اسیر سود وزیاں نہیں ہے

کامل محمد آبادی اعظم گڑھ کے شعراء میں ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔بلا مبالغہ آپ کو اسم بامسمیٰ کہا جا سکتا ہے۔عربی وفارسی میں کامل دسترس حاصل تھی۔آپ نے غزلوں،قصیدوں کا بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے۔مراثی کا ایک مجموعہ بھی ''عیار کامل'' کے نام سے شائع ہوا۔آپ کے تین قطعات کی تضمین صفی لکھنوی نے کی تھی۔آپ نے غزلوں میں بھی اپنی انفرادی شان کے جوہر دکھائے ہیں۔لیکن قصیدہ آپ کا خاص میدان ہے۔زبان وبیان پر عبور کامل اور الفاظ کے در وبست کا نظام آپ کو صف اول کے قصیدہ نگاروں میں شامل کر دیتا ہے۔ایک قصیدے کے چند بند پیش ہیں:

زلف کیسی ،عیسوی سنبل شکن اندر شکن
ہر شکن میں کس قدر عقدے ،ہزار اندر ہزار
نطق کیسا عیسوی دم طبع کیسی ،بذلہ سنج
رمز کیسی ،دلربا تقریر کیسی،عشوہ کار
آنکھ میں کیا ؟ سرمہ سرمہ کس طرح کا دلفریب
کس جگہ کا اصفہانی طرز کیا دنبالہ دار
ہاتھ کیسے؟ سرخ کیسے سرخ جیسے رنگ خوں
ساق کیسی ؟ صاف کس شئ کی طرح،آئینہ دار
تیر مژگاں کس طرح کا راست مانند خدنگ
تیغ ابرو کس طرح کی ،خم بہ شکل ذوالفقار

محسن اعظم گڑھی (پہلے کے شعراء اعظمی نہیں لکھتے تھے۔ جناب یحییٰ اعظمی نے سب سے پہلے اپنے نام کے ساتھ اعظمی لکھا) عربی و فارسی کے علاوہ علوم دینیہ کے بھی واقف اسرار تھے۔ فلسفہ، منطق ،ادب، ہیئت اور فقہ وغیرہ پر عبور حاصل تھا۔ آپ مشہور شاعر عزیز لکھنوی کے شاگرد تھے۔ آپ انجمن ترقی اردو ہند کے شعبۂ تصانیف سے بھی وابستہ رہے۔ ۱۹۵۲ء میں پاکستان چلے گئے۔ چار مجموعۂ کلام شائع ہو چکے ہیں۔ ''پیام محسن''، ''محسن العزاء''، ''آئینہ فکر''، ''اجمال فکر'' ۔آپ کا خاص میدان غزل ہے۔ لیکن راقم الحروف کو آپ کی غزلیں نہ مل سکیں، البتہ مرثیہ کا ایک بند پیش ہے:

اے اسپ با وفا یہ تیری شان دلبری
حامل ہر ایک حسن کا ہر عیب سے بری
بیٹھا ہے تیری پشت پر شبیر ساحری
تکتا ہے نقش پا کو تیرے چرخ چنبری
پیشانی زمیں پہ ٹیکا ہے رات کا
یا قفل گر گیا ہے در کائنات کا

ترک وطن کر کے پاکستان چلے جانے والے شعراء میں یاور اعظمی بھی ایک منفرد مقام رکھتے ہیں ۔آپ نے سول کورٹ فیض آباد میں رجسٹریشن ڈپارٹمنٹ میں ملازمت کی۔ ۱۹۵۰ء میں پاکستان چلے گئے۔ اور وہاں ریوینو ڈپارٹمنٹ میں اکاؤنٹنٹ جنرل ہو گئے۔ بنیادی طور پر مرثیے کے شاعر ہیں اور اس صنف میں کمال حاصل ہے۔ آپ کے مرثیوں میں بانکپن، روانی، اور تیزی پائی جاتی ہے۔ آپ کے ایک مرثیے کا ایک بند پیش ہے:

جب قلزم اخلاق کی بڑھتی ہے روانی
چہروں پہ چڑھاتا ہے نئے حسن کا پانی
سر اپنا جھکا لیتا ہے ہر دشمن جانی
دم بھر میں بدل جاتے ہیں جذبات نہانی

ہوتا ہے پشیماں بشر اپنی خطا پر
کفار بھی لے آتے ہیں ایمان خدا پر ۳۸؎

اعظم گڑھ میں اردو ادب کو اپنی زندگی بنا لینے والوں میں فخر الاسلام اعظمی کا نام بہت اہم ہے ۔آپ تقریباً ایک درجن کتابوں کے مصنف ہیں ۔آپ نے زیادہ تر کتابیں طلباء کے ذہنی معیار اور علمی استعداد کو مدنظر رکھتے ہوئے لکھی ہیں ۔اپنی کتابوں کی غایت تصنیف کی وضاحت کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں:

''ایسی (درسی کتب) کتابوں میں مصنف کو اپنی مخصوص سطح کے ساتھ ساتھ طلباء میں 'اقبالیات' سے متعلق معیاری کتابوں کے مطالعہ کا شوق پیدا ہو'' ۳۹؎

اور بلاشبہ آپ اپنے اس دعوے میں کامیاب ہیں ۔آپ طلباء کی نفسیات پر گہری نظر رکھتے ہیں ۔یہی وجہ ہے کہ آپ کی یہ ہلکی ہلکی کتابیں آندھرا پردیش، اڑیسہ، اور اتر پردیش کے بعض ڈگری کالجوں میں داخل نصاب ہیں، یا امدادی کتب کی حیثیت سے زیر مطالعہ رہتی ہیں ۔آپ ایک خوش فکر شاعر بھی ہیں ۔آپ کی ایک غزل کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

میں زخم زخم ترے شہر مہرباں میں ہوں
جھلس رہا ہوں یہ مانا کہ سائباں میں ہوں
حصار جسم سے باہر نکالنا مجھ کو
ازل سے قید رہی جسم کے مکاں میں ہوں
میں جی رہا ہوں ترے ظلم کی پناہوں میں
یہ کیسے کہوں کہ میں شہر بے اماں میں ہوں
کڑی ہے دھوپ زمانے کی غم نہیں نازش
میں اپنی ماں کی دعاؤں کے سائباں میں ہوں

شعرائے اعظم گڑھ کی فہرست میں عرفان اعظمی کا نام بھی قابل ذکر ہے ۔کسی علمی و تدریسی پیشے

سے تعلق نہ ہونے کی وجہ سے مختلف مشاغل کو ذریعۂ روزگار بنانا پڑا جس کی وجہ سے باقاعدہ طور پر ادبی حلقوں سے وابستگی نہ ہوسکی ۔ایسے کاموں سے بھی سابقہ پڑا جن کو شعروشاعری کے ساتھ بعد مشرقین ہے،ایسے حالات میں بھی شاعری سے آپ وابستہ رہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ خود شاعری نے آپ کا دامن نہ چھوڑا۔حالات کی ستم ظریفیوں اور خشک پیشوں سے وابستگی کے باوجود فکروفن کے سوتے خشک نہیں ہوئے ۔آسان زبان میں شاعری کرنے پر ملکہ حاصل ہے ۔بڑی وجدانگیز غزلیں کہتے ہیں ۔نظمیں بھی عمدہ اور دلکش ہوتی ہیں ۔آپ نے گردوپیش کے سنگین مسائل کو بڑے سلیقے کے ساتھ غزل کے نازک قالب میں سمویا ہے ۔لیکن فکر میں وہ گہرائی نہیں پیدا ہوسکی ہے جس کا متعلقہ موضوعات تقاضہ کرتے ہیں ۔نتیجتاً شاعری میں مصوری کے بجائے فوٹو گرافی کی صفت پیدا ہوگئی ہے ۔لیکن اس کے باوجود اسلوب نگارش اور انداز بیان کا دل سے قائل ہونا پڑتا ہے ۔ایک غزل درج ذیل ہے:

اس قدر بڑھ گئے ہیں اندھیرے اٹھ گیا روشنی کا جنازہ
اب نہ ڈھونڈھے خوشی کو زمانہ جارہا ہے خوشی کا جنازہ
سخت راہوں میں جب چلتے چلتے لڑکھڑاتے قدم زندگی کے
بڑھ کے دو گام فورا اٹھایا موت نے زندگی کا جنازہ
کس قدر خودغرض ہے زمانہ آج دشمن ہے انساں کا انساں
ہے یہ ممکن اٹھائے نہ کل تک آدمی آدمی کا جنازہ
سیم وزر کی دلہن سے یہ کہہ دو بے رخی اتنی اچھی نہیں ہے
ڈالدے اپنے آنچل کا سایہ بے کفن ہے کسی کا جنازہ

حواشی

۱- حیات شبلی، ص۳۷

۲- حیات شبلی، ص۳۷

۳- حیات شبلی، ص۴۷

۴- مضامین رشید، ص۳۵

۵- مضامین رشید، ص۴۱

۶- مضامین رشید، ص۴۰

۷- مضامین رشید، ص۴۲

۸- مقالات احسان، ص۱۰۰

۹- حیات سلیمان، ص۶۳۳

۱۰- گنج ہائے گراں مایہ، ص۱۰۴

۱۱- سہیل کی سرگذشت، ص۳۱۰

۱۲- تبصرہ مشمولہ نشاط روح اصغر گونڈوی، ص۳۹

۱۳- تبصرہ مشمولہ نشاط روح اصغر گونڈوی، ص۶۳

۱۴- تبصرہ مشمولہ نشاط روح اصغر گونڈوی، ص۱۷

۱۵- تبصرہ شمولہ نشاط روح اصغر گونڈوی، ص۱۷

۱۶- دارالمصنفین اعظم گڈھ کی ادبی خدمات، ص۳۷۷

۱۷- تذکرہ ماہ وسال، ص۱۷

۱۸- تعارف نوائے عصر یحییٰ اعظمی

۱۹- تعارف نوائے عصر یحییٰ اعظمی، ص۱

۲۰- تذکرہ معاصرین، ص۲۴

۲۱- تعارف نوائے عصر یحیٰ اعظمی، ص۲

۲۲- امجد نمبر ۹۵-۱۹۹۶، ص۵۲-۵۳

۲۳- خلیل الرحمٰن میرا بھائی، پرواز اصلاحی، اعظمی نمبر، ص۴۲

۲۴- علی گڈھ کی چند ادبی شخصیتیں، شاعر اعظمی نمبر، ص۴۲

۲۵- فکروفن (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) از خلیل الرحمٰن اعظمی، ص۵۴

۲۶- نیا عہد نامہ، کے فلیپ رائے، آل احمد سرور

۲۷- کاغذی پیرہن، از خلیل الرحمٰن اعظمی

۲۸- حرف حق، حسین اعظمی، ص۶

۲۹- حرف حق، حسین اعظمی، ص۷

۳۰- حرف حق، حسین اعظمی، ص۸

۳۱- حرف حق، حسین اعظمی، ص۲۵

۳۲- حرف حق، حسین اعظمی، ص۶۵

۳۳- ادب اور حقیقت، ص۳۰

۳۴- ادب اور حقیقت، ص۸۷

۳۵- ادب اور حقیقت، ص۹۷

۳۶- ضبط شدہ نظمیں، مرتبین، خلیق انجم، مجتبیٰ حسین، ص۳۱

۳۷- القصہ مختصر، مختصر اعظمی، ص۱۶

۳۸- قصیدہ نگاران اتر پردیش، علی جواد زیدی، جلد اول

۳۹- اقبال کی نظموں کا تجزیاتی مطالعہ، پیش لفظ

باب سوم

انوراعظمی حیات اور کارنامے

فصل اول: حیات انور

فصل دوم: کارہائے انور

حیات انور

آسمانِ اردو ادب پر بکھرے ہوئے ان گنت روشن ستاروں میں سے ایک ستارہ انور اعظمی کے نام سے موسوم ہے۔ ان کی ولادت اعظم گڑھ کے ایک مشہور و معروف گاؤں مہوارہ میں ۱۹؍ جولائی ۱۹۲۶ء کو ہوئی، انھوں نے جس گھرانے میں آنکھیں کھولیں وہ گاؤں کے قرب و جوار میں ایک ذی حیثیت و مہذب گھرانا شمار کیا جاتا تھا۔

تعلیم

انور اعظمی کی تعلیمی شروعات پانچ سال کی عمر میں ہوئی۔قرآن مجید، دینیات، خوش نویسی اور اردو کی ابتدائی تعلیم ایک لائق استاد مولوی عبدالوحید صاحب کی نگرانی میں گھر ہی پر دلائی گئی۔ دس سال کی عمر میں ان کا داخلہ ملک کی مشہور و معروف اور اپنے نہج تعلیم کے لحاظ سے منفرد و ممتاز قرآنی درس گاہ مدرسۃ الاصلاح میں کرایا گیا۔ جہاں سے انھوں نے ۱۹۴۷ء میں عربی زبان و علوم دینی کی تکمیل کی اور سند فراغت حاصل کی۔

انگریزی حصولِ تعلیم کے لیے شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ سے بھی وابستہ رہے لیکن اس کا سلسلہ زیادہ دنوں تک نہیں چل سکا۔ غالباً اس کی وجہ ان کی سیماب نوش طبیعت تھی جس نے انھیں اس ماحول میں ٹھہرنے نہیں دیا، کیونکہ ان کے سینے میں اصلاح اُمت اور احیائے اسلام کا ولولہ ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

انور اعظمی اس درجہ منکسر المزاج اور باعمل انسان تھے کہ اپنے اوپر کسی بے جا تکلف کا پردہ ڈالنا بھی پسند نہیں کرتے تھے، وہ حد درجہ علم کے شوقین تھے اور باوجود اعلیٰ قابلیت و ذہن رسا کے مطالعہ و استفادہ کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ زمانہ طالب علمی اور بعد میں بھی اکثر و بیش تر مولانا اختر احسن اصلاحی مرحوم کی خدمت میں حاضر رہتے، اس کا مقصد صرف اور صرف علمی جستجو کی تسکین تھا، اسی

ذیل میں انھوں نے مولانا حمیدالدین فراہیؔ کے کئی ایک غیر مطبوعہ مسودات کو صاف اور نقل کرنے کی خدمت بھی اپنے ہاتھوں انجام دی۔ یہ مسودات مولانا اختر احسن صاحب کے پاس ایک محفوظ امانت کی طرح تھے۔ اور ہر کس و ناکس کی پہنچ سے دور بھی، اس کو حاصل کر کے انور اعظمی نے اپنے شوق مطالعہ کو بھی پورا کیا۔

شعر و شاعری کے سلسلہ میں اپنے اعظم گڑھ کے دورانِ قیام میں علامہ اقبال سہیلؔ سے قریب رہے اور ان سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا۔ اسی طرح اپنے مشفق استاد مولانا نورالہدیٰ اصلاحیؔ سے وسیع و گہرے تعلقات استوار کیے، مولانا موصوف اردو و فارسی ادب کا نہایت عمدہ ذوق رکھنے کے ساتھ ساتھ، خود بھی ایک اچھے خوش ذوق شاعر تھے، چونکہ انور اعظمی کو زمانہ طالب علمی ہی سے شعر و شاعری سے خاص شغف تھا۔ اس لیے وہ ان سے بہت قریب اور حد درجہ بے تکلف ہو گئے۔ ان کی مجلسوں کو دیکھ کر یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ ان کے درمیان استاد اور شاگرد کا بھی رشتہ تھا۔ ذوق و رجحان طبع کی یکسانیت نے انھیں جیسے دو برابر کے بے تکلف دوستوں کی سطح پر رکھ دیا تھا۔ لیکن انور اعظمی ہزار ذوقی یکسانیت و شاعرانہ بے تکلّفیوں کے باوجود اس کوچے میں مولانا کا احترام باقی رکھے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ انھیں ''مرشد'' کا نام دے رکھا تھا۔ جو کہ زمانے تک مولانا کے ہم مذاق شاعر و ادیب و دوستوں اور شاگردوں کے حلقہ میں زبان زد تھا۔

درس وتدریس

تعلیمی سلسلہ منقطع ہونے کے بعد انھیں اپنی محبوب درس گاہ مدرسۃ الاصلاح ہی میں درس و تدریس کی خدمت انجام دینے کے لیے کہا گیا، جسے انھوں نے بخوشی منظور کر لیا اور پوری محنت ولگن کے ساتھ اس میں منہمک ہو گئے۔ درس وتدریس کی وابستگی میں نہ تو نفع حاصل کرنے جیسے کسی مقصد کو دخل تھا اور نہ تو کسی مخصوص روایتی مزاجی ہم آہنگی کو۔ اس لیے کہ اتنی بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ مدارس عربیہ کی مدرّسی کسی صاحب ذوق، ذی حیثیت و کشادہ دست آدمی کے لیے کس حد تک فائدہ مند و نفع بخش ثابت ہو سکتی ہے۔ اور جن لوگوں نے انور اعظمی کو قریب سے دیکھا ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ انھیں اس

کام سے کوئی طبعی مناسبت بھی نہ تھی اور نہ ہی وہ ایک مخصوص ومحدود قسم کے خیالات وتصورات کی دنیا میں رہنے والے انسان تھے۔ اور نہ ہی اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے کوئی مجبور انسان کہ اس کام کے علاوہ انھیں کوئی دوسرا کام کرنا ہی نہ آتا ہو۔

انور اعظمی کو تعلیم دینے کے معاملہ میں ایک خاص مہارت حاصل تھی، جس کا اندازہ مدرسۃ الاصلاح میں ان کے دور معلّمی اور اسلامی درس گاہ رام پور میں کچھ دنوں کے کام کرنے سے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ برما میں جن دنوں وہ اپنی حق گوئی و بے باکی کے ہاتھوں ''البلاغ'' سے الگ ہو کر ''بے کاری'' کی مشکل میں پھنس گئے تھے، اس مشکل سے نکالنے کے لیے انھیں ان کے دوستوں نے وقتی طور پر ٹیوشن کے مشغلہ میں لگا دیا تھا۔

ٹیوشن کے اس دور میں ان کی کارگذاریوں نے ان کی گراں قدر خدمات کا اعتراف سبھی سے کرا لیا تھا۔ انور کے عزیز دوست جناب محمد عمر صاحب جو ان دنوں برما میں رہتے تھے، کہتے ہیں کہ اس وقت انور میرے ایک بچے کو بھی پڑھاتے تھے۔ اس کی تعلیم کی ابتداء کرتے ہی انور نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ عمر میں تمہارے بچے کو چند مہینوں میں اپنے ہاتھوں خط لکھ لینے کی صلاحیت تک پہنچا دوں گا۔ اور واقعی میں ہوا بھی ایسا ہی۔

عمر صاحب کا کہنا ہے کہ انور کا انداز تعلیم اتنا دلچسپ اور اچھوتا ہوتا کہ بچے نہ تو تعلیم کو کہیں سے بار محسوس کرتے اور نہ ان میں اکتاہٹ اور فراری ذہنیت پیدا ہونے پاتی، بلکہ ہر روز ان کا شوق علم بڑھتا جاتا اور ان کی علمی لیاقت ترقی کرتی جاتی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ انور اعظمی اپنے افکار و خیالات کے اعتبار سے ایک نہایت ہی روشن دماغ اور بلند عزم کے مالک اور اپنی صلاحیتوں کے لحاظ سے گوناگوں اور متنوع خصوصیات کے حامل شخص تھے۔ اس مشغلہ سے ان کی وابستگی میں ان کے بے پناہ جذبہ خدمتِ دین اور احیائے اسلام کی دیرینہ و مضطرب آرزو کی کارفرمائی تھی، جس کے ذریعہ ان کے پیش نظر ایسے اذہان وافراد کی تیاری تھی جو ''انقلابی شخصیت'' بن کر اٹھ سکیں اور اس کام کے لیے مطلوبہ طاقت کا توازن قائم کرسکیں۔

اخلاق و عادات

انورا عظمی اپنے اخلاق و عادات کے لحاظ سے ایک سادہ مزاج، خوش خو وملنسار، غیّور وخوددار، وسیع الظرف، بردبار، شریف النفس اور غم خوار انسان تھے۔

مزاج کی سادگی

اپنے رہن سہن، لباس، خوراک میں خوش ذوق مگر سادگی پسند تھے، سادہ غذائیں پسند تھیں مگر دسترخوان کی صفائی وآداب کا حد درجہ لحاظ رکھتے۔ کپڑے معمولی واوسط درجہ کا زیب تن کرتے مگر ان کی صفائی کا خاص طور پر خیال رکھتے، کبھی کبھی شیروانی وسوئیٹر وغیرہ بھی پہنے ہوئے نظر آتے لیکن اکثر معمولی کپڑوں، صرف پاجامہ وقمیص ہی میں ہوتے اور یہاں تک کہ ان ہی لباس میں سفر وغیرہ بھی کرتے۔ سردیوں میں اکثر ایک ہلکی سی اونی چادر لپیٹ لیتے۔ وقت اور مقام کی نسبت سے کسی بے جا تکلف اور خاص اہتمام کی الجھن میں نہ پڑتے۔ یہاں تک کہ شادی کے بعد بھی اکثر انھیں معمولی اور سادہ کپڑوں میں سسرال تک جا پہنچتے۔

جب تک ان کی اہلیہ کو ان کی افتادِ طبع اور اس کی تہہ میں چھپی ہوئی ان کی دلنواز شخصیت کا علم نہیں ہوا تھا وہ اکثر وبیش تر ان سے نالاں رہتی تھیں۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ وہ سردیوں کے دنوں میں ایک معمولی سی چادر لپیٹے اپنی سسرال جا پہنچے۔ اتفاق سے اسی دن اس خاندان میں ایک مہمان اور بھی آئے ہوئے تھے۔ جو کہ سوٹ بوٹ میں تھے۔ یہ دیکھ کر ان کا پارہ ساتویں آسمان پر پہنچ گیا کیونکہ ہر عورت کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کا شوہر خوش پوشاک ہو، شاید انورا عظمی کو اس کا اندازہ ہوگیا، پوچھنے لگے، کیوں بھئی کیا بات ہے۔ یہ چہرہ مہرہ اترا سا کیوں ہے۔ اتنے میں وہ غصے سے بالکل پھٹ پڑیں، کیا آپ کے پاس گرم کپڑے نہیں؟ ہنس کر کہنے لگے، اچھا تو یہ بات ہے، خیر برا نہ مانو۔ آئندہ سے تمہارے یہاں کپڑے ہی آیا کریں گے۔

ملنساری وخوش خوئی

انور اعظمی نہایت ہی خوش خو اور ملنسار تھے، چہرہ روشن اور ہونٹوں پر ایک تبسم کا سا انداز ہمیشہ کھیلتا رہتا، ہر شخص سے نہایت تپاک اور کھلے دل سے ملتے، اپنی ذات سے کسی کو دکھ پہنچانا یا ادنیٰ درجہ کی زحمت دینا کبھی گوارہ نہ کرتے، ہر شخص سے محبت وخلوص کا برتاؤ کرتے۔ اگر کبھی یہ احساس ہو جاتا کہ ان کی کوئی بات کسی کے لیے تکلیف کا موجب بن گئی ہے تو فوراً اس سے معذرت خواہ ہوتے اور تلافی کی ہر ممکن صورت اختیار کرتے۔

ایک بار کا واقعہ ہے کہ کان پور کسی دوست کے یہاں گئے اور کافی دیر سے پہنچے جب تک گھر کے تمام افراد سو چکے تھے۔ دو ایک بار ہلکی سی دستک دی، پھر یہ سوچ کر کہ مزید کوشش میز بان دوست کے آرام میں خلل انداز اور تکلیف کا موجب ہوگی، وہیں زینے کے پاس فرش پر چادر لپیٹ کر پڑے رہے اور رات بھر یوں ہی پڑے رہ گئے۔

ایک مرتبہ کسی دوست کے یہاں گئے ان صاحب کے کچھ پیسے انور اعظمی کے ذمہ نکلتے تھے انھوں نے دوران گفتگو اس کی طرف اشارہ کیا تو اسے جھٹ ایک کتاب جو ان کے ہاتھوں میں تھی تھما دی اور کہنے لگے بھائی تم میری یہ کتاب اپنے پاس رکھ لو، یہ کہیں زیادہ قیمتی اور کار آمد ہے اگر میں پیسے دے سکا تو لے جاؤں گا ورنہ یہ اب تمہاری ہے۔

غیرت وخودداری

غیرت وخودداری کا جوہر بھی ان میں بدرجۂ اتم موجود تھا۔ اہل ثروت ونخوت کے سامنے جھکنا یا ان کی ناز برداری کرنا ان کی فطرت کے خلاف تھا وہ اپنی ضروریات کے سلسلے میں محتاج رہ جانا گوارہ کر لیتے یہاں تک کہ فاقہ تک کر جاتے مگر کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا ہرگز پسند نہ کرتے۔ غریبوں کی محفل میں سو بار دوڑے چلے جاتے مگر اہل ثروت کی دعوت بھی ٹھکرا دیتے۔ یہی وجہ تھی کہ اکثر لوگ انھیں مغرور وخود پسند سمجھتے اور ان کے دشمن بن جاتے۔

انور کی خودداری کا ذکر کرتے ہوئے ان کے برمی دوست شمیم مولمینی لکھتے ہیں کہ:

''خودداری کا تو یہ عالم تھا کہ فاقہ کر جاتے مگر زبان نہ کھولتے، دوستوں سے ہمیشہ خوش خوش ملتے اور جو کچھ اپنے پاس ہوتا ان کی خاطر تواضع پر نچھاور کر دیتے''۔ ۱

ان کے ایک اور برمی ساتھی آئی، ایم، ڈی، باگیہ فرماتے ہیں:

''وہ بہت ہی خوددار، غیور، اور حق گو انسان تھے۔ اسی لیے بعض زمانہ ساز و مصلحت پسند اصحاب کی نگاہوں میں چڑھ گئے تھے، جنھوں نے ان کے خلوص کو جھٹلایا اور مکر و فریب سے تعبیر کیا، لیکن خدا کا شکر ہے کہ حقیقت چھپ نہ سکی اور یہاں کے منصف مزاج اہل علم کی ایک بڑی تعداد ان کی ہم خیال و ہم نوا بن گئی''۔ ۲

شاعر برما حضرت احمر رنگونی رقم طراز ہیں:

''میں انور مرحوم کی اس خوبی کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا کہ ان میں خوش اخلاقی کے ساتھ خودداری بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ ہنس مکھ اور خلیق ضرور تھے لیکن دولت و طاقت کے آگے جھکنا نہیں جانتے تھے، صاف گو آدمی تھے، اور لگی لپٹی رکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اسی لیے بعض اوقات ان کی صاف گوئی پر ''گفتار تلخ'' کا الزام بھی آجاتا تھا''۔ ۳

وسعت ظرف و بردباری

ظرف و بردباری کا یہ عالم تھا کہ اپنے اوپر کی گئی نکتہ چینی کو بھی بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کر لیتے تھے اور اپنے مخالفین کے لیے کبھی نازیبا الفاظ کا استعمال نہیں کرتے تھے۔ بڑی سے بڑی مصیبت برداشت کر لیتے مگر کبھی بھی کوئی ناشائستہ طرز عمل اختیار نہ کرتے۔ مخالفتوں پر ان کا رویہ ہمیشہ درگزر کا ہوتا، بڑے سے بڑے دشمن سے بھی محبت کا سلوک کرتے، یہی وجہ تھی کہ دوست تو دوست دشمن بھی ان کی وسعتِ ظرف کے معترف تھے۔ محمد سلطان لطیفی مدیر پرواز انقلاب لکھتے ہیں:

''مرحوم نے پرواز کے مخالفین کو بھی مایوس نہ کیا، ایسے مضامین اور مراسلے بھی اپنے اخبار میں شائع کرنے سے گریز نہ کرتے جو ان کی ذات اور اخبار کے خلاف

ہوتے''۔۴

آئی-ایم-ڈی باگیہ صاحب فرماتے ہیں:

''اخلاق کے لحاظ سے بہت بلند و قابل تعریف ادیب تھے۔ اپنے مخالفین کا ذکر بھی کبھی برے لفظوں میں نہیں کرتے تھے''۔۵

قلندر شاہ تحریر فرماتے ہیں:

''ان کے کردار میں اس قدر پختگی تھی کہ ناشائستہ مخالفت اور غصہ میں لانے والی تنقیدوں کا جواب بھی مہذبانہ طور پر دیا کرتے تھے۔ صحیح اعتراضات کی قدر کرنا ان کا شیوہ تھا۔ اس سلسلے میں ردوکد ان کے نزدیک ایک اخلاقی جرم تھا''۔۶

شرافت نفس

انور اعظمی حد درجہ شریف تھے۔ جھوٹ، غیبت، چغلی وغیرہ سے انھیں سخت نفرت تھی۔ اس سلسلے میں ان کا یہ دستور تھا کہ اگر کوئی شخص ان عیوب میں ملوث ہوتا اور وہ ان سے چھوٹا ہوتا تو اسے مناسب انداز میں ٹوک دیتے اور اس سے باز رہنے کی تلقین فرماتے اور اگر بڑا ہوتا تو وہاں سے خاموشی کے ساتھ اٹھ جاتے۔

وہ حد درجہ تحمل و حکمت کی دولت سے بھی مالا مال تھے۔ سخت گیری و شدت کے رویے کو نہ تو کبھی اپناتے اور نہ دوسروں کے لیے پسند کرتے۔ محبت و نرم خوئی، حکمت و خیر خواہی کو انسان کا بہترین وصف گردانتے۔ دوسروں کی غلطیوں کو معاف کر دیتے اور خود نقصان اٹھا لینے میں بڑے فراخ دل تھے۔ ایک مرتبہ دھوبی کو اپنی نئی شروانی دھلنے کو دی، اتفاق کی بات کہ وہ اس سے گم ہوگئی، دھوبی نہایت غریب اور تاوان دینے سے قاصر تھا۔ ڈرا سہما انھیں اطلاع دینے پہنچا، اُسے پریشان و متفکر دیکھتے ہی کہنے لگے کیوں بھئی کیا بات ہے، آج اتنے اداس کیوں دکھائی دے رہے ہو؟ اور جب دھوبی نے انھیں جھجکتے ہوئے اصل بات بتائی تو انھیں اس پر کوئی رنج نہیں ہوا بلکہ انھوں نے جھٹ جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک روپیہ نکال کر اس کے ہاتھ میں رکھ دیا اور مسکراتے ہوئے بولے لو جاؤ اس کی مٹھائی کھا لینا، فکر نہ کرو گم

ہوگئی تو جانے دوا اور بن جائے گی۔

انور اعظمی اپنے گھر، خاندان، بستی اور حلقۂ احباب میں حد درجہ محبوب انسان تھے، وجہ یہ تھی کہ ان کا برتاؤ سب کے ساتھ نہایت شریفانہ، خیر خواہانہ اور پُر محبت ہوتا تھا، وہ کبھی کسی کا بُرا نہ چاہتے اور کسی کے درپے آزار نہ ہوتے، حسب مراتب ہر شخص کی خدمت و رفاقت، تہذیب و تربیت کو لازمۂ حیات جانتے۔ ماں باپ، بڑے بوڑھوں کی خدمت و فرماں برداری کرتے، بھائی بہن اور چھوٹوں کے ساتھ محبت و شفقت کا برتاؤ کرتے، دوستوں کے لیے دیدہ و دل فرش راہ کیے رہتے، دوستوں کے دوست اور غیروں کے غم گسار بن کر رہتے۔ خدمت انسانیت کو حاصل حیات گردانتے اور اس کے لیے شدائد و مشکلات کی راہوں سے ہوکر ایثار و قربانی کی عظیم منزلوں سے گذر جاتے۔

انور اعظمی باوجود اس اعلیٰ علمی مرتبت کے اپنی گھریلو معاشرت کے اندر حد درجہ سادہ مزاج و عملی انسان واقع ہوئے تھے، بے جا تکلف ظاہر کا کوئی احساس انھیں چھو تک نہ گیا تھا، گھر کا ہر چھوٹا، بڑا کام خود اپنے ہاتھوں بحسن و خوبی انجام دے لیتے، زراعت جوان کا گھریلو اور آبائی مشغلہ تھا اس کے کاموں سے کلی واقفیت و دلچسپی رکھتے تھے، اور حسب ضرورت ہر مرحلہ پر ہر کام خود اپنے ہاتھوں انجام دے لیتے تھے یہاں تک کہ بیلوں کی ناند میں صبح سویرے اٹھ کر چارہ اور پانی بھی خود اپنے ہاتھوں سے ڈالا کرتے تھے۔

دینی و ملی سرگرمیاں

انور اعظمی اپنے عادات و اطوار، اخلاق و معاشرت میں متذکرۃ الصدر صفاتِ حسنہ سے متصف ہونے کے باوصف قدرت کی طرف سے اعلیٰ درجہ کا ذہن رسا، گداز قلب بھی لے کر آئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بالعموم بنی نوع انسان کی دردمندی و بالخصوص ملتِ اسلامیہ کی بہی خواہی کا جذبہ انھیں ہمہ وقت نہ صرف بے چین و مضطرب بلکہ کچھ نہ کچھ سوچتے اور کرتے رہنے پر مجبور کیے رکھتا تھا۔ مسائل کا انبار اور مشکلات کا ہجوم ان کی طبع رواں کے لیے رکاوٹ ثابت ہونے کی بجائے مہمیز کا کام دیتا تھا، وہ جو کچھ سوچ لیتے اُسے عملی جامہ پہنانے کے لیے تن من دھن کی بازی بھی لگا دیتے تھے۔

دنیا کی موجودہ پریشانیوں اور عالم انسانیت کے عام بگاڑ کو ختم کرنے کی ان کے نزدیک ایک ہی سبیل تھی اور وہ تھی اسلام کے منصفانہ و عادلانہ اصولوں پر مبنی نظام زندگی کا قیام، انور کے اس اندازِ فکر سے نہ صرف ان کا قریب ترین حلقہ آگاہ تھا بلکہ یہی بات وہ زندگی بھر پریس واسٹیج سے منظر عام پر لاتے رہے اور ایک دنیا کو اپنی اسی حیثیت سے روشناس کراتے رہے، ان کے ایک برمی دوست ابوبکر آزادان کے اس ذہنی پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

''آپ کی زندگی کا اصل مقصد اسلام ہی پر جینا اور اسلام ہی پر مرنا تھا، آپ کی کائنات صرف اسلام تھی، اور اس کے سوا کچھ بھی نہیں''۔ ۷؎

دل درد آشنا تڑپا نگاہ دور بیں مچلی

یہ بات کہ اسلامی تعلیمات کی اشاعتِ عام اور اس کی حاکمانہ قوت کا غلبہ تام ہی آج کی سکوں نا آشنا دنیا کے حفظ و بقا اور فوز و ارتقاء کا ضامن ہے، انور کا یہ ایک عقیدہ ہی نہ تھا بلکہ پختہ ایمان بھی جس نے انھیں سراپا اضطراب بنا کر رکھ دیا تھا۔ اور اس وقت جب وہ ابھی نوعمری کی منزل میں تھے اور تعلیم کا سلسلہ جاری ہی تھا، اسی جذبہ کے تحت انھوں نے سوچ سمجھ کر اصلاح اُمت کے مختلف پروگرام بنائے اور چلائے۔ ۱۹۴۷ء کا وہ پُر آشوب زمانہ جب کہ ہندوستان ایک پُرفتن انقلاب کی منزل سے گذر کر آزادی وتقسیم کے خون رنگ، شہر جنوں میں داخل ہونے والا تھا، اس وقت اُمتِ مسلمہ کا سفینۂ ملّی بحر سیاست کی ہلاکت خیز موجوں میں جس بُری طرح ہچکولے کھا رہا تھا، اس نے ان کے حساس دل کو تڑپا کر رکھ دیا اور باوجود متعلمانہ مصروفیات کے وہ اصلاح امت کا فریضہ بقدر وسعت وصلاحیت کار انجام دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

جمعیۃ اصلاح المسلمین

اس سلسلے کا پہلا کام انھوں نے یہ کیا کہ درجات عالیہ کے ذہین و فعال طلبہ کو جوڑ کر ایک تنظیم اصلاح المسلمین کے نام سے قائم کی، جس سے ان کا مقصود جواں سال وصاحبِ صلاحیت طلباء کے اندر علوم دینی کے ساتھ ساتھ اسلام کے وسیع انقلابی نقطۂ نظر کو ابھار کر ان کی غایتِ فکر و مطمح نظر بنا دیا تھا۔ جو

اکثر و بیشتر حالتوں میں مروجہ طریقۂ تعلیم کے واسطے مدارس عربیہ کے اندر یکسر مفقود ہوکر رہ گیا ہے۔

اس تنظیم کے ذریعہ انھوں نے اپنے گرد ایک ایسے حلقہ کو منظّم کر لینے میں نمایاں کامیابی حاصل کی، جوان کی اُمنگوں کا موزوں ترین مظہر تھا، اس حلقہ نے نہ صرف مدرسہ کی فضا ہی پر خوش گوار اثرات ڈالے بلکہ قرب و جوار اور دور دراز کے ان مقامات تک جہاں ان کی پہنچ ہوسکی بیداری کی مطلوبہ صالح و صحت مند لہر دوڑا دی۔

تسنیم

اس ذیل کا دوسرا اہم کام انھوں نے انجام دیا اور جوان کے جوہر صلاحیت کا خاص مظہر قرار دیا جاسکتا ہے وہ ایک بلند پایہ اور اعلیٰ معیار کا ہفت روزہ قلمی اخبار ہے جسے وہ ''تسنیم'' کے نام سے عرصہ تک تربیت دیتے رہے۔ اس اخبار کے مندرجات، نظم ونثر، مقالات، حالات حاضرہ پر تبصرے، عام فکری رجحانات اور ملکی تحریکات پر تنقیدی شذرے، صالح وصحت مند، اہم اور وقیع اشاریے، اس درجہ ولولہ انگیز واثر آفریں ہوتے کہ نہ صرف طلبہ ان کے گرویدہ تھے بلکہ اکثر حالتوں میں فاضل اساتذہ اور بالغ نظر سربراہانِ مدرسہ تک سے خراج تحسین حاصل کرتے۔

یہ اخبار انور کی فکر کا نمائندہ اوران کی آرزوئے بیتاب و بےچین روح کا ترجمان خاص تھا، جس کا حرف حرف ملت کے درد میں ڈوبا ہوا ہوتا اور ایک ولولہ تازہ اور نشاط کار کا پیغامبر بن کر سرگرم سفر ہوجانے کی دعوت دیتا۔

اصلاح عوام کی مہم

اس کے ساتھ ساتھ انور نے اسی زمانے میں اپنی بستی میں بھی ایک انجمن بنا رکھی تھی، جس کا مقصد و لائحہ عمل ہی یہ تھا کہ بستی کے اندر اسلامی انداز سے سدھار پیدا کی جائے۔ عقائد کی درستگی، عبادات کی بجا آوری، اخلاق ومعاملات کی صفائی و پاکیزگی کا کام ایک منصوبے کے ساتھ انجام دینا اس انجمن کے فرائض میں داخل تھا۔ چنانچہ انور نے اس کے ذریعہ اپنے یہاں بہت سی غلط رسموں کی اصلاح کی۔ روزے نماز کی پابندی کی ایک فضا قائم کی۔ اجتماعی معاملات میں لوگوں کو حق وانصاف اور اسلامی

فیصلے کا پابند بنانے کی کوششیں کیں۔

تحریک اسلامی سے وابستگی

انور قدرت کی طرف سے ایک نہایت ہی بیدار ذہن اور مضطرب روح لے کر پیدا ہوئے تھے۔ سلیم الطبعی کا جامہ سچ مچ ان پر راست آتا تھا۔ اسلامی تعلیم نے اس رنگ کو اور زیادہ گہرا اور پختہ بنایا۔ اسلام اور ملتِ اسلام کی کسمپرسی و زبوں حالی پر ان کا دل خون کے آنسو روتا اور ہمہ وقت انھیں مضطرب رکھتا۔ ان کی اُمنگوں اور آرزوؤں کا ایک ہی مرکز ومحور تھا اور وہ تھا اسلام کو غالب اور ملتِ اسلام کی شیرازہ بندی کر دینا۔

یہی وہ چیز تھی جس نے انھیں ملک میں چلنے والی اسلامی تحریک جماعت اسلامی کی طرف متوجہ اور پھر باضابطہ اس سے وابستہ کر دیا۔ یہ تحریک ان کی اُمنگوں کی مظہر خاص اور ان کے دل بے قرار کی صدائے بازگشت بن گئی۔ وہ اس سے وابستہ ہی نہیں ہوئے بلکہ اپنی تمام تر صلاحیتوں اور توانائیوں کے ساتھ اس کے دست و بازو بھی بن گئے۔

بقول محترم کوثر اعظمی صاحب:

> **''تحریکِ اسلامی سے ان کی وابستگی کے ساتھ ساتھ ذمہ دارانِ تحریک کو ان کی اعلیٰ درجہ کی تحریری صلاحیتوں اور فکری توانائیوں کا بخوبی اندازہ تھا، چنانچہ اسی احساس نے ذمہ دارانِ تحریک کو مجبور کیا کہ وہ موصوف کی خدمات کو تحریک کی تصنیفی مہم کے لیے حاصل کریں۔**
>
> **انور مرحوم جو کہ دوسرے لفظوں میں نام ہی تھے بے لوث خدمتِ دین کے جذبۂ بیتاب کا وقت آنے اور ضرورت پڑنے پر انھوں نے خود کو اس محاذ پر بھی کام آجانے کے لیے پیش کر دیا۔ اور ایک عرصہ تک مرکز تحریک رام پور میں رہ کر تحریک کے مرکزی نقیب ماہنامہ ''زندگی'' کو ترتیب دینے کا فریضہ انجام دیتے رہے۔''** [۸]

برما کا سفر

۱۹۵۲ء میں اپنے چچا جناب شیخ عبدالحمید صاحب مرحوم کی دعوت پر برما کا سفر کیا۔ شیخ عبدالحمید مرحوم برما میں ایک صاحب جائداد، رائس مل کے مالک اور لکڑی کے بہت بڑے کاروباری تھے۔ اپنی بزرگی اور اپنی برمی اولاد کی نالائقیوں کے سبب انھوں نے انور کو اپنے کاروبار کی نگرانی کے لیے طلب کیا تھا۔ انور اعظمی نے وہاں پہنچ کر اپنی ذمہ داریوں کو سنبھال لیا مگر بعض گھریلو پیچیدگیوں اور اس کام سے اپنی ذوقی وطبعی نامناسبت کے سبب جلد ہی الگ ہوگئے۔

برما میں احیائے اسلام وتنظیم ملت کی کوششیں

انور اعظمی جب برما گئے تو ساتھ ساتھ اپنا یہ اندازِ فکر اور دردِ دل بھی لے گئے، چنانچہ انھوں نے گھوم پھر کر ملتِ اسلام کا گہرا جائزہ لیا، نتیجتاً اس جائزے نے انھیں بے چین کردیا اور وہ کاروباری بکھیڑوں سے الگ ہوکر اصلاح ملت کی مہم میں لگ گئے۔ انور کے اس ذہنی تاثر کی تصویر کشی کرتے ہوئے کریم اللہ کوکب صاحب لکھتے ہیں:

> **''مرحوم نے یہاں گھوم پھر کر مسلمانوں کی حالت کا جائزہ لیا، انھیں سیاست وصحافت میں کمزور دیکھ کر مجھ سے کہنے لگے: استاد کیا ہی اچھا ہوتا کہ یہاں آزاد پریس قائم ہوتا، جو یہاں کے مسلمانوں کو سمجھایا جاسکتا کہ تم مسلمان ہو دنیا میں تمہارے بھائی ستر کروڑ کی تعداد میں ہیں، کئی ایک سلطنتوں اور بے مثال تاریخ کے مالک بھی۔ تمھیں احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ اور تم اپنے آپ کو مسلمان کہلانے سے شرماؤ نہیں''۔[۹]**

انور کا یہی وہ جذبہ اور ان کی مخلصانہ کوششیں تھیں جس نے برما میں نہ صرف یہ کہ ان کے لیے کام کی راہیں کھولیں بلکہ ان کے اردگرد ایک ایسے حلقہ کو بھی منظّم کردیا، جو اس مہم میں ان کا ہم نوا وہم سفر بنا، اس ذیل میں پرواز وانقلاب کے مینجنگ ایڈیٹر آئی، ایم، ڈی باگیہ صاحب رقم طراز ہیں کہ:

''مرحوم جب رنگون آئے تو اپنے ساتھ خدمتِ اسلام و ہمدردی قوم کا قابل قدر جذبہ بھی لائے، انھوں نے اس جذبے کے زیر اثر خود بھی کام کیا، اور یہاں کام کرنے والوں کا ایک گروہ بھی پیدا کر دیا''۔ ۱۰

مراجعت وطن اور پیغام کان پور کی ادارت

۱۹۶۰ء میں بعض اسباب کے تحت وہ برما کو خیر باد کہہ کر ہندوستان چلے آئے، واپسی پر کچھ دنوں تک وہ گھر ہی پر رہے پھر اپنے عزیز دوست مولوی قمر الدین اصلاحی صاحب کے بلاوے پر کان پور چلے گئے، اور روز نامہ پیغام کے ادارہ سے منسلک ہو گئے۔ اس وقت سے آخر دم تک اسی ادارے سے منسلک رہے اور بحیثیت مدیر معاون اخبار کی ادارت کا فریضہ انجام دیتے رہے۔

وفات

کم و بیش ایک سال ادارۂ پیغام سے منسلک رہنے کے بعد اوائل ۱۹۶۱ء میں بیمار ہو کر گھر آ گئے، بیماری دورانِ سر کی اور پہلے پہل ہلکی چلتی رہی، بعد میں اس نے اتنی شدت اختیار کر لی کہ ان پر مسلسل غشی کے دورے پڑنے لگے اور بالآخر یہ منحوس بیماری جان لیوا ثابت ہوئی۔ علاج ہوتا رہا، اطباء اپنی جیسی کرتے رہے، اعزہ بھاگ دوڑ میں لگے رہے مگر قدرت کو تو کچھ اور ہی منظور تھا، ان کی زندگی کے ایام پورے ہو چکے تھے اور ان کے لیے مالک حقیقی کا بلاوا آ چکا تھا اور اس بلاوے پر وہ بروز دوشنبہ ۶/ مارچ ۱۹۶۱ء کو اپنے رب سے جا ملے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

کارہائے انور

انور اعظمی کی ادبی زندگی تقریباً پندرہ بیس سال کے مختصر سے عرصے پر محیط ہے۔ انھوں نے اپنا ادبی سفر لگ بھگ پندرہ سال کی عمر میں شروع کر دیا تھا، انور نے اپنی زندگی کے اس مختصر سے سفر میں اپنے ادیب کے لیے تخلیق کے مواقع فراہم کرنے کے لیے انھوں نے زندگی کے صفحات کو مختلف زاویے سے دیکھا ہے اور بے شمار تجربات کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ ہر صنف ادب سے متعلق وافر ذخیرہ معلومات و نگاہ بصیرت رکھنے کے ساتھ ساتھ خود بھی اعلیٰ درجہ کے ادیب اور ہر صنف ادب پر دسترس رکھنے والے تھے۔ انور نے مختلف اصناف ادب میں طبع آزمائی کی ہے۔ مقالات، طنز و مزاح، خطابت، نظمیں، غزلیں، افسانے، ڈرامے سبھی کچھ لکھ لینے پر یکساں قدرت رکھتے تھے، انور کی ادبی شخصیت کے بارے میں، آئی، ایم، ڈی باگیہ رقم طراز ہیں:

> **''ان کے لکھنے کا کمال یہ تھا کہ وہ بہ یک وقت نظم بھی کہتے اور نثر بھی لکھتے، پھر یہ نظم و نثر بھی مختلف النوع ہوتے، نظم کہتے کہتے غزل شروع کر دیتے، مزاحیہ مضمون کی داغ بیل ڈال دیتے تھے''**۔[۱۱]

یہ کچھ انور کا کمال صلاحیت ہی نہ تھا بلکہ قدرت کی ایک فیاضانہ ودیعت بھی جس نے انور کو ان کمالات کا جامع بنا رکھا تھا، ذوقی و تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ انور خدمتِ ادب کا بھی والہانہ و مخلصانہ جذبہ رکھتے تھے۔ ادیب کوئی سا بھی ہو اس سے تعلق خاطر نسبت ذوق و صلاحیت کی بنیاد پر رکھتے اور اس کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے میں ہر ممکن تعاون کرتے۔

مشہور رومی ادیب ترگنیف کے تذکرے میں آتا ہے کہ وہ اپنے ملک کے نوخیز ادیبوں کی حوصلہ افزائی اور ان کی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے کے لیے عجیب و غریب طریقے اپنایا کرتا۔ ان کی تخلیق کردہ ادب پاروں کی اصلاح اور ان کی تعریفیں کرنے کے عام طریقہ کے علاوہ کبھی خود سے مضامین لکھ کر ان

کے نام سے اخبارات و رسائل میں چھپواتا، کبھی و یران جرائد کو ان کے مضامین کے ساتھ اپنی جیب سے رقمیں بھیج کر ہدایت کرتا کہ وہ انھیں ادارہ کی طرف سے بطور معاوضہ یا انعام پیش کر دی جائے اور اس سب سے مقصود صرف یہ ہوتا کہ یہ نئے قلم کار ابھر کر اور اپنا تمام تر جوہر صلاحیت نکھار کر محاذ ادب کے جانباز و جاں نثار سپاہی بن جائیں۔

انور نے جو بے لوث ادبی خدمات انجام دی ہیں وہ تر گنیف کے مقابلے میں نئی انوکھی اور زیادہ نہ سہی پھر بھی اپنے دور کے لحاظ سے حیرت انگیز ضرور ہیں، دور طالب علمی میں قلمی جرائد کے ذریعہ جہاں وہ ایک طرف اپنے عزیز ترین وگراں مایہ افکار و نظریات کو سامنے لاتے وہیں اپنے ہم عصر دوستوں کی صلاحیتوں کو بھی نکھارتے رہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ انور نے اس دور میں کتنوں کو اور کیسے کیسے قلم کار بنایا، ادب دوستی و ادیب نوازی ان کی فطرت ثانیہ تھی، ہر لکھنے والے کی قدر و منزلت اور حوصلہ افزائی نہایت خوش دلی و شوق سے کرتے۔

اس سلسلے کا اصل و قابل قدر کارنامہ انھوں نے برما جیسی اردو کے لیے ناموزوں و نامساعد سخت و سنگلاخ سرزمین پر انجام دیا، برما اور بالخصوص اس کے شہر رنگون میں اردو پائی تو ضرور جاتی تھی لیکن زبان وادب کا صحیح ذوق اردو زبان کے لیے اچھے ادیب و قلم کار ناپید تھے، انور نے ایک صحیح و بلند مذاق ادب پیدا کیا اور شعراء و ادباء کی ایک اچھی خاصی کھیپ تیار کر کے رکھ دی۔

صحافت کی وادی میں

برما کے اس مختصر قیام میں انھوں نے ایک اچھا خاصا سنجیدہ و متین حلقۂ تعارف پیدا کر لیا تھا، اپنے چچا کے کاروبار سے علیٰحدگی کے بعد ان کے احباب نے انھیں برمی صحافت میں آنے کا مشورہ دیا۔ اس کام سے انور کو ایک تو ذوقی و طبعی مناسبت بھی تھی، دوسرے برمی مسلمان جو وہاں کی آبادی میں ایک قابل لحاظ حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے حالات کا تقاضا بھی تھا کہ انور اس مشورہ کو قبول کر لیں، چنانچہ وہ باقاعدہ طور پر میدانِ صحافت میں اُتر آئے۔

انور نے اپنی صحافتی زندگی کے سفر کا آغاز ہفت روزہ ''البلاغ'' سے کیا اور روزنامہ ''پرواز'' ہفت

روزہ ''انقلاب'' کے ذریعہ منزل مقصود تک پہنچے۔ وہ وہاں کے آسمانِ صحافت پر ایک ستارہ بن کر ابھرے اور نیر اعظم بن کر چھا گئے۔ انور جب تک برما میں رہے، اقلیم صحافت میں ان کا طوطی بولتا رہا، عوام و خواص سبھی ان کی تحریروں کے دلدادہ اور ان کی فکر کے گرویدہ تھے، انھوں نے برمی صحافت کے معیار کو بلند و باوقار بنایا۔ بے لاگ، دیانت دارانہ وصحت مند پالیسی کا اصول عام کیا۔ حق گوئی، جرأت و بے باکی کی اعلیٰ مثال قائم کی۔

آزادو بااصول صحافت کی تشکیل

انور نے اصلاحِ ملت اور خدمتِ اسلام کا سب سے بڑا ذریعہ ایک آزاد و بااصول صحافت کو قرار دیا۔ انور سے پہلے برما کی اردو صحافت پر ایک مخصوص اندازِ فکر رکھنے والے طبقہ، علماء کی اجارہ داری قائم تھی اور یہی طبقہ برمی ملتِ اسلامیہ کے سیاہ سفید کا مالک بنا ہوا تھا، جس نے صحافت کے ذریعہ پوری قوم پر جمود و بے حسی کی ایک فضا سی طاری کر دی تھی اور مذہبی مناقشات کے الجھاؤ میں ڈال کر اسے انتشارِ فکر و عمل کے مرض میں بری طرح مبتلا کر دیا تھا۔ اس وقت عالم یہ تھا کہ اصلاح و تعمیر کی کوئی کرن افق صحافت سے پھوٹتی نظر ہی نہ آئی تھی۔

ہفت روزہ البلاغ

انور اعظمی نے برما میں اپنی صحافتی زندگی کا آغاز ہفت روزہ ''البلاغ'' سے کیا اور انقلاب سے نا آشنا و جمود پذیر ماحول کو غفلت کی نیند سے بیدار کرنے کا آغاز کیا، مگر بدقسمتی سے یہ اخبار خود ایک ایسے ہی طبقہ سے تھا جسے اپنی روش خام پر کسی تنقید یا دعوتِ اصلاح کی بات برداشت نہ تھی، چنانچہ انور اور اخبار کے مالکان کے درمیان نا اتفاقی پیدا ہو گئی۔ اس موقعہ پر انور نے پوری ہمت کے ساتھ ہاتھ آئے ہوئے موقع کو ٹھکرا دیا اور اخبار سے علیٰحدگی اختیار کر لی۔ اسی کے ساتھ یہ اخبار بھی نکلنا بند ہو گیا۔

روزنامہ پرواز و ہفت روزہ انقلاب

''البلاغ'' سے انور کی علیٰحدگی بڑی پریشانیون کا سبب بن گئی، انھوں نے سب کچھ ہنس ہنس کر کے برداشت کر لیا اور چہرے پر شکن تک نہ آنے دی، مگر اپنے منصوبوں کا خون ہوتے دیکھ کر تڑپ

اٹھے۔ اوران کے دل میں کرب وغم کا ایک ایسا طوفان اٹھ کھڑا ہوا اور انھیں اس وقت تک سکون نہیں ملا جب تک کہ انھوں نے ایک آزاد پریس کی بنیاد نہ رکھ لی اور روزنامہ ''پرواز'' اور ہفت روزہ ''انقلاب'' جاری نہ کرلیا۔

ان اخبارات اور پریس کے ذریعہ انور اعظمی کے پیش نظر کام کا جو منصوبہ تھا وہ انھیں محمد سلطان حقیقی نے ان الفاظ میں مختصراً بیان کیا ہے:

''ایک تو یہ تھا کہ مسلمانانِ برما میں سیاسی شعور پیدا ہو، دوسرے اسلام کی خدمت کا جذبہ پیدا ہو''۔[۱۲]

چنانچہ انھوں نے اپنی تحریروں میں اس بات پر پورا زور صرف کیا کہ اسلامیانِ برما کے اندر جو جمود وتعطل کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے وہ پوری طرح سے ختم ہو۔ انتشار وتفرقہ دور ہو اور ان میں قومی یک جہتی وملی ہم آہنگی پیدا ہو، اس سلسلے میں ان کے فکر کی جو تصویر ابوبکر آزاد نے کھینچی ہے وہ اپنے جملہ خدو خال کے اعتبار سے ایک نہایت ہی دلآویز صحیح ومکمل تصویر ہے، لکھتے ہیں:

''وہ ایک بااصول آدمی تھے، دین وملّت سے انھیں بے پناہ محبت تھی۔ اسلامیانِ برما سے انھیں دلی لگاؤ تھا، ان کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ مسلمانانِ برما آپس میں مل کر قومی، ملی اور ملکی خدمات انجام دیں، وہ اپنے اندر ایسی اسپرٹ اور ایسا اخلاق پیدا کریں جس سے غیر مسلم بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ ان کی خواہش تھی کہ اسلامیانِ برما ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوں، ان کا خدا ایک، رسول ایک، مذہب ایک، تہذیب وتمدن ایک تو پھر ان کا مقصد زندگی بھی ایک ہو، وہ خواب غفلت سے بیدار ہوں، جمود کی چادر اتار پھینکیں اور زندگی کے میدان میں آگے بڑھیں، ان کا قول تھا کہ فرقہ پرستی اور تعصب ایک لعنت ہے جس کی موجودگی میں قوم کبھی ترقی نہیں کرسکتی۔

کبھی کبھی وہ اسلامیانِ برما کے جمود وغفلت اور اسلامی اداروں کی نااہلی سے پریشان ہوکر کہتے یہ جمعیتیں، کونسلیں، انجمنیں، یونینیں اور ادارے سب کے سب ایک

خوبصورت لیبل ہیں اس سے قوم کبھی اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچ پائے گی، قوم کو بیدار کرنے اور ان کے اندر ملی اسپرٹ پیدا کرنے کے لیے ایک ٹھوس عملی اور متحدہ یونین کی ضرورت ہے جو نسلی اور قومی تعصب، خود غرضی اور بدعنوانی سے پاک ہوکر پوری قوم کی قیادت کر سکے۔

وہ الگ الگ تنظیم کے سخت مخالف اور اجتماعی تنظیم کے قائل تھے، تفریق و فرقہ پرستی سے انھیں قطعی نفرت تھی، وہ ایک مفکر، دور اندیش انجام بیں انسان تھے وہ قوم و ملت کے لیے ایک سود مند نظریہ رکھتے تھے''۔[۱۳]

قومی و ملی اتحاد کے اس خواہش مندانہ اظہار کا بدلہ بھی انور کو خوب خوب ملا۔ یعنی ایک طرف جہاں دلوں نے ان کی ضرورت و اہمیت کو محسوس کیا، وہیں دوسری طرف زبان و قلم نے ان کے خلاف ایک ''معرکہ جہاد'' بھی بپا کر دیا۔ اس ''مقدس'' جنگ کے سردار برما کے علماء ٹھہرے، اس کا اندازہ جناب وکیل صاحب کی اس تقریر سے ہوتا ہے، جو انھوں نے مسلم اسٹوڈنٹ سوسائٹی کی طرف سے انور اعظمی کی وفات پر منعقد کیے گئے جلسہ تعزیت میں کی، فرماتے ہیں:

''یہ آپ ہی کی ذات گرامی تھی کہ جو علمائے دین کو جو خواب خرگوش میں پڑے خرّاٹے لے رہے تھے اور یہاں مسلم قوم کے مختار مطلق بنے ہوئے تھے پیدا کیا اور قوم کو ہوشیار و بااختیار کیا۔ علمائے دین کے ایوانوں میں جو عشرت کدے بن چکے تھے بھونچال آیا اور وہ چیخ پڑے''۔ حالانکہ بات کچھ اور تھی اور صرف اتنی سی کہ اس صورتِ حال پر تنقید کے ذریعہ مخلصانہ اصلاح ملت کا راستہ نکالا جائے مگر ''ہمارے علمائے دین نے غلط اندازہ لگایا۔ مرحوم کو ان کی تحقیر و تضحیک منظور نہ تھی بلکہ وہ چاہتے تھے کہ علماء درحقیقت علمائے دین کہلانے کے مستحق بن جائیں اور ان میں جو خامیاں آ گئی ہیں وہ کسی طریقے سے دور ہو جائیں کیونکہ قوم بغیر اچھے رہبر کے صحیح راستہ پر گامزن نہیں ہو سکتی''۔[۱۴]

چند مخصوص لوگوں کی مخالفت کے باوجود عام مسلمانوں پر ان کے اس طرز فکر کے نہایت ہی گہرے اور دوررس اثرات مرتب پڑے۔ اور برما کا ہر آدمی اس کی ضرورت و اہمیت کو اچھی طرح سے محسوس کرنے لگا۔

چنانچہ اوچوکوں جامع مسجد کے امام مولانا عبدالاول نے ان کی وفات پر جمعہ کے ایک تعزیتی جلسے میں انورؔ کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا:

''مرحوم نے پرواز وانقلاب کے ذریعہ مسلمانانِ برما میں صحیح اسلامی سپرٹ پیدا کی، یہ آپ کی تحریروں ہی کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے حق کی حمایت کو اولین فریضہ سمجھا، آپ صرف شاعر، جرنلسٹ اور مصنف ہی نہیں بلکہ خادم اسلام بھی تھے اور آپ کی تحریریں اس کا زندہ ثبوت ہیں''۔ ۱۵؎

نظر دریاباآبادی صاحب فرماتے ہیں:

''جنگ عظیم کے بعد یہاں کے مسلمانوں کی خوش بختی تھی کہ انور جیسا بیدار مغز صحافی و ادیب، اردو داں طبقے کو ملا، جس نے لیڈری کا سوانگ رچائے بغیر ایک صحافی کی حیثیت سے قوم کو جمود، بے حسی، اور غفلت سے جگانے کی کوشش کی''۔ ۱۶؎

برمی زبان میں اجرائے اخبار کی کوششیں

اردو صحافت میں اس انقلابی قدم کے ساتھ ساتھ ان کی دلی خواہش تھی کہ برمی زبان میں بھی ایک اخبار نکالا جائے تا کہ اسلام اور ملتِ اسلام کی آواز اور ان کے احساسات اہل برما تک پہنچائے جاسکیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ برمی مسلمان اردو زبان سے بالکل نابلد یا بہت کم واقفیت رکھتے تھے، جس کی وجہ سے ان کی بات کا مکمل طریقے سے سمجھ لینا یا اس کا مقصد حاصل کر لینا ان کے لیے کلی طور پر ممکن نہ تھا، چنانچہ انھوں نے اس کے لیے اپنی جیسی ہر ممکن کوشش اور تگ و دو اختیار کی یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے اس کی سب سے بڑی وجہ غالباً یہ رہی ہے کہ ان کا قیام برما میں بہت مختصر رہا ہے، اگر وہ برما میں کچھ دن اور رہتے تو یقیناً وہ اپنے مقصد میں پوری طرح سے

کامیاب ہو سکتے تھے۔اس صورت حال کے بارے میں سیف الدین شاہد رقم طراز ہیں:

''مرحوم نے حد سے زیادہ اس بات کی کوشش کی کہ یہاں سے برمی زبان میں ایک اخبار نکالا جائے تاکہ اس کے ذریعہ وقت کی پکار ان کے کانوں تک پہنچائی جاسکے، اگر چہ ان کی یہ کوشش رائگاں گئی، تاہم وہ اس حد تک اپنے مشن میں ضرور کامیاب ہوئے کہ لوگوں کی ذہنی سطح کسی قدر بدل گئی، ایک نیا ولولہ اور تازہ جوش ان کے دلوں میں پیدا ہو گیا۔افسوس وہ آج ہم میں نہ رہے ورنہ اپنے مشن میں مکمل طور پر کامیاب ہوتے''۔۱۷

اردو زبان کی ترقی

انور اعظمی نے صحافت کے ذریعہ اردو زبان وادب کی بہت زیادہ خدمت کی اور اس کے معیار کو برما کے ماحول میں بامِ عروج پر پہنچایا، لوگوں میں زبان کا صحیح مذاق پیدا کیا، اور خود اردو لکھنے والوں کی تہذیب وترتیب کی اور بقول منظورالحق خان منظور:

''انور مجھ سے اکثر کہا کرتے میری دلی خواہش ہے کہ برما میں اردو زبان کے اچھے اچھے ادیب پیدا ہوں اور یہی وجہ تھی کہ وہ ہر لکھنے والے کی بھرپور ہمت افزائی کرتے''۔۱۸

اور اس طرح انھوں نے برما میں اچھے لکھنے اور زبان وادب کا صاف ستھرا ذوق رکھنے والوں کی ایک اچھی خاصی کھیپ تیار کردی۔

حق گوئی وبے باکی

انور اعظمی کو برما میں اپنی صحافتی زندگی کے اندر بڑے سخت حالات سے گزرنا پڑا۔مخالفتوں کا وہ طوفان جوان کے خلاف صحافت میں دیانت دارانہ وصحت منداصولوں کے اختیار کرنے پر اٹھایا گیا۔اس کا یہ تقاضہ تھا کہ وہ اپنے نظریات واصولوں کو بے لوث اور مخلصانہ طور پر پیش کریں، وہیں یہ بھی تھا کہ اس معاملے میں وہ پوری جگری، جرأت، بے باکی وحق گوئی کا ثبوت دیں، چنانچہ انھوں نے ان تقاضوں کو

باحسن طریق پورا کیا اور بقول نظیر دریا آبادی ان کا اصول ہی تھا کہ:

''اگر صحافت قوم کی رہبری کر سکتی ہے تو اسے صحت مند، نڈر اور جری ہونا چاہیے ورنہ بیمار ادب پوری قوم کو روگ لگا دے گا''۔۱۹

سیف الدین صاحب کہتے ہیں کہ:

''مرحوم سرتاپا اسلامی جذبہ رکھتے تھے، حد سے زیادہ جیوٹ اور بے باک تھے ان کی دلی خواہش تھی کہ یہاں کے مسلمان ایک پلیٹ فارم پر آ جائیں اور اپنا سیاسی مقام حاصل کریں''۔۲۰

یا پھر قلندشاہ کے الفاظ میں:

''...... وہ ایک حق پرست اور صاف گو صحافی تھے۔ ...... اور ان کی یہی وہ حق پرستی و صاف گوئی تھی جس نے ہماری قوم کے اکثر مفاد پرست وخود پسند افراد کو ان کی مخالفت ومعاندت پر مجبور کر دیا...... ان میں صبر وتحمل کے ساتھ اولوالعزمی و دور اندیشی کا جوہر بھی موجود تھا وہ مخالفین و معاندین کی ہنگامہ آرائی اور جوڑ توڑ سے مطلق بے خوف تھے۔ جس بات کو حق سمجھتے، اس کے اظہار میں ذرا بھی نہ ہچکچاتے اور جو کچھ کہنا ہوتا کھل کر کہہ دیتے، چباچبا کر باتیں کرنا ان کی نظر میں معیوب اور ایک بزدلانہ فعل تھا''۔۲۱

بحیثیت مجموعی انور اعظمی کو جو فریضہ انجام دینا تھا اس کے لیے ایسا کرنا بہت ضروری تھا، اگر یہی خاصیت ان کے اندر موجود نہ ہوتی تو شاید وہ اس سے عہدہ برا بھی نہ ہو پاتے اور یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی صاف گوئی، جرأت و بے باکی کو صرف قلم تک ہی نہیں محدود رکھا بلکہ ضرورت پڑنے پر وہ عملاً بھی اس کسوٹی پر کھرے اُترے۔ ''البلاغ'' کی دورادارت میں جب اخبار کے مالک حسن شاہ سے اختلاف رائے ونظریہ کا قصہ چلا تو بعد میں پیش آنے والی پریشانیوں کی ذرّہ برابر بھی پرواہ نہ کی بلکہ فوراً اخبار سے الگ ہو گئے اور اپنے تکلیف دہ زمانے کو بڑے صبر وحوصلہ کے ساتھ گزار لے گئے، مگر اپنی آزادیٔ رائے، حق گوئی و بے باکی کو کسی بھی حالت میں مجروح نہیں ہونے دیا۔

کام کے لیے انور مرحوم کی عادت ایثار و جذبۂ قربانی

انور اعظمی کی خصلت میں یہ بات پوری طرح پیوستہ تھی کہ وہ جس کام کا ارادہ بناتے اسے شوق و رغبت کے ساتھ انجام تک پہنچانے کی کوشش کرتے، اگرچہ اس راہ میں کتنے بھی مصائب و مشکلات پیش آتے وہ پوری قوت کے ساتھ اس کا مقابلہ کرتے بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ کام کے سلسلے میں ہر طرح کی قربانی پیش کرنے کے لیے ہمہ وقت بالکل تیار رہتے، اس کا ثبوت ان کی صحافتی زندگی کے ان ابتدائی واقعات سے ملتا ہے، جو انھیں پیش آئے۔ پرواز و انقلاب کے بانی مبانی سبھی کچھ انور اعظمی تھے اس لیے بھی اس سے ان کا لگاؤ بالکل عام اور دلچسپی سے پُر تھا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھیں اس بات کا بھی احساس بدرجہ اتم تھا کہ ان کے عزیز برمی دوست بھائی ایوب میاں، آئی، ایم، ڈی باگیہ، یوسف واینا، ایم، ای جیوا وغیرہ نے تمام تر انور ہی کی تحریک پر اس کام میں قلمی و مالی معاونت کی تھی، ان کی معاونت و رفاقت کی پاسداری اور ان کے حقوق کی محافظت بھی انھیں کا ذمہ ہے۔ اس سلسلے میں نظر دریا آبادی رقم طراز ہیں:

''روز نامہ پرواز کی ابتداء ہی سے انور مرحوم اس میں شامل ہوئے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ پرواز کا اجراء ہی انور مرحوم کی وجہ سے ہوا۔ جو لوگ پرواز کے بانی تھی وہ قطعاً نا تجربہ کار ہونے کے باوجود صحافت و اخبار کی ذمہ داریاں اٹھانے کے لیے محض انور ہی کے رغبت دلانے پر تیار ہوئے اور یہ حقیقت ہے کہ اگر انور نے اس جانفشانی اور ہمت سے دور اوّل میں سہارا نہ دیا ہوتا تو اردو کے اور بہت سے روز ناموں اور ہفت روزوں کی طرح جو اپنی موت آپ مر گئے پرواز کا انجام بھی معلوم تھا۔

انور کو ہمیشہ یہ احساس رہا کہ پرواز کے بانیوں نے ہزار ہا روپیہ نفع اندازی سے قطع نظر صرف کر کے پرواز کا اجراء محض جذبۂ قومی، خدمتِ اردو اور برمی مسلمانوں کے مذہبی و سیاسی مسائل و حقوق کی محافظت اور ان میں بیداری پیدا کرنے کی غرض سے عمل میں لائے ہیں ...... چنانچہ اسی نظریہ کے پیش نظر بغیر کسی سے الجھے وہ اپنا کام کرتے رہے''۔ ۲۲

انور اعظمی کی ایثار و قربانی کا یہ حال تھا کہ کئی کئی ماہ بغیر تنخواہ کے ہی کام کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اپنی بنیادی ضروریات کی بھی پرواہ نہ کرتے۔ ایک وقت ایسا بھی آ گیا تھا کہ اخبار کے خلاف ریشہ دوانیاں اپنی انتہا کو پہنچ گئیں۔ ان میں سے ایک کوشش یہ تھی کہ کسی طرح سے اس نوخیز ادارہ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے، دوسرے ''انور اعظمی'' کو خرید لینے کی کوشش کی گئی، لیکن انور نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ ''بکاؤ مال'' نہیں کہ ان کی قیمت لگ سکے۔

یہ مخالفین اپنی فطرت مخالفت سے مجبور و پریشان، انھیں اس بات کی کیا خبر تھی کہ انور نے اس کام کی ابتداء ذاتی منفعت کے نقطۂ نظر سے اوپر اٹھ کر ایک عظیم و اعلیٰ تر مقصد کے لیے کی ہے۔ جو ان کی زندگی کا ایک مشن اور متاع عزیز ہے۔ اس صورت حال کی وضاحت نظر دریا آبادی نے ان الفاظ میں کی ہے:

> **''ابتدائی ایام میں خود انور کو سنہری مواقع بہم پہنچائے گئے، لیکن وہ غیور و خود دار شخص بجائے اس کے کہ کوئی ناجائز فائدہ حاصل کرتا، بغیر طمع و لالچ کے کئی کئی ماہ تک اپنی تنخواہ سے بے نیاز ہو کر کام کرتا رہا............ اور اپنے حوصلہ میں کوئی فرق نہ آنے دیا''۔** ۲۳

کام کی دھن

پرواز و انقلاب کے دور ادارت میں جب کہ ان کا جوہر صحافت پوری آب و تاب کے ساتھ جگمگا رہا تھا، برمی میدان صحافت کے پرانے ''اجارہ دار'' بوکھلا اٹھے اور ایک نئے ستارے کو ابھر کر نیر اعظم بنتے ہوئے دیکھ کر مختلف گوشوں سے پل پڑے اور ان کی مخالفت میں صف بستہ ہو گئے۔ جہاں تک خیالات و نظریات، افکار و آراء سے اختلاف کا تعلق تھا، انور اعظمی پوری متانت و استدلال سے ان کا سامنا کرتے رہے، یہاں تک کہ صحافت کی دنیا میں ان کے نام کا سکہ چلنے لگا۔ مگر ایک وقت ایسا بھی آیا جب انھیں بڑے اوچھے ہتھیاروں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اخبار سے لکھنے والوں کا سلسلہ کاٹ دینے اور اس کے اسٹاف کو منتشر کر دینے کی کوششیں کی گئیں۔ یہاں تک کہ ان کے کاتب بھی اُڑا لیے گئے، مگر دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ انور نے اس موقع پر جس شرافتِ نفس، صبر و ثبات اور حوصلہ مندی کا ثبوت دیا وہ بے مثال ہے اس وقت ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے انور اعظمی آدمی نہ ہو بلکہ ان تھک کام کرنے کی کوئی مشین ہو۔ مضامین،

اڈیٹوریل، تبصرے، مزاحیہ کالم خود لکھتے، خبروں کے ترجمے کرتے، انھیں ترتیب دیتے اور پھر خود اپنے ہاتھوں کتابت کرتے، پریس میں کاپی جماتے، اس وقت عالم یہ تھا کہ رات ہو یا دن، انور پر ہمہ وقت بس ایک ہی دُھن سوار ہوتی، کام اور کام، آرام کا کوئی لمحہ ان کی زندگی میں تھا ہی نہیں۔ یہ دلچسپ داستان خود ان کے دوستوں اور مشاہدوں کی زبانی ملاحظہ کیجیے:

''بارہا ایسا ہوا ہے کہ صبح ۱۱ بجے سے دوسرے دن صبح نو بجے تک انور نے مسلسل ڈیوٹی دی ہے خود ترجمہ کر رہے ہیں، خود ہی کتابت کر رہے ہیں، اداریہ اور مزاحیہ کالم بھی لکھا جا رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ کاپی بھی جمائی جا رہی ہے، یہ انور ہی کا حوصلہ تھا کہ پرواز کو ابتداء ہی سے چھ صفحات پر پیش کیا اور طرہ یہ کہ کبھی ایسا نہ ہوا کہ وہ کسی صبح شائع نہ ہوا ہو''۔۲۴ (نظیر دریا آبادی)

''اس کم عمری کی حالت میں مرحوم کا اٹھارہ اٹھارہ گھنٹوں تک کام کرنا دیکھ کر میں عش عش کر اٹھتا''۲۵ (محمل چچا)

''آپ بہ یک وقت کئی کام کرتے، اداریہ، گلگشت اور دیگر مضامین لکھتے ایجنسی کی رپورٹ کا ترجمہ بھی خود کرتے، انھیں زبان وقلم، نظم ونثر پر برابر کی قدرت حاصل تھی، جب کام میں مشغول ہوتے تو اردگرد کا احساس نہ رہتا اور اس درجہ انہماک کے ساتھ اپنا کام کرتے گویا دنیا ومافیہا سے بے خبر ہوں''۔۲۶ (ابوبکر آزاد)

''قلمی کام کرنے میں بڑے مستحکم واقع ہوئے تھے، لکھنے پر آتے تو دس دس بارہ بارہ گھنٹوں تک جم کر لکھتے''۔۲۷ (آئی، ایم، ڈی باگیہ)

''مرحوم کام کے دوران جب تک کہ کام ختم نہ ہو جائے کوئی اور دوسرا کام نہ کرتے حتی کہ کھانا بھی نہ کھاتے جیسے کوئی کام اگر صبح سویرے شروع کر دیا اور وہ ختم ہوا شام کو ۳ بجے تو پھر درمیان سے ناشتہ اور دن کا کھانا سب گول کرواتے''۔۲۸

(منظور الحق خان منظور)

''پرواز میں یوں تو انور مرحوم ادارت کے فرائض انجام دیتے تھے مگر صحیح معنوں میں

وہی اڈیٹر، وہی معاون، وہی مترجم اور اکثر مواقع پر وہی کاتب بھی تھے‘‘۔۲۹

(سیف الدین شاہد)

’’ایک اچھے اخبار کا مدیر ہونے کے لحاظ سے انھیں ہر کام کا پورا بوجھ رہتا۔حصول علم میں ان کی حالت بسا اوقات دیوانگی سے مشابہ ہوتی، کتب بینی اکثر رات کے ایک یا ڈیڑھ بجے تک چلتی جسے دیکھ کر یہ محسوس ہوتا کہ یہ شخص شمع زندگی کچھ اس طرح روشن کیے ہوئے ہے کہ اس کے جلد ہی بجھ جانے کا خطرہ ہے‘‘۔ (خواجہ بشیر احمد) ۳۰

حلقۂ ادب

انور اعظمی نے رنگون میں اپنے ادب نواز دوستوں کی مدد سے ایک حلقۂ ادب قائم کر رکھا تھا، جس کا مقصد صاحبِ ذوق حضرات میں ادب سے انسیت پیدا کرنا تھا، اور ان کے اندر پوشیدہ صلاحیتوں کو نکھار کر قابل قدر قلم کار بنانا تھا۔حلقۂ ادب رنگون کے جوائنٹ سکریٹری محمد اسماعیل صاحب کہتے ہیں:

’’انور مرحوم کو حلقۂ ادب سے خاص لگاؤ تھا وہ اُسے مفید مشورے دیتے بلکہ یوں کہیے کہ آج حلقۂ ادب اردو کی جو تھوڑی بہت خدمت انجام دے رہا ہے وہ سب انھیں کا رہین منت ہے مرحوم اس حلقہ کے نو آموز شعراء کے کلام پر اصلاح دے کر ان کی کافی سے زیادہ حوصلہ افزائی فرماتے‘‘۔۳۱

برما میں ادب نوازی و ادیب سازی کا مشغلہ:

انور اعظمی اپنے رفقاء میں اس حیثیت سے بہت زیادہ محبوب و مقبول انسان تھے کیونکہ وہ ان کے ذوق ادب کی آبیاری اور ان کی صلاحیت تحریر و بیان کی نشو ونما میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے اور خصوصی توجہ سے کام لے کر انھیں پروان چڑھاتے، اس سلسلے میں انور کی داستانِ کارکردگی خاصی معلومات افزا ہے جسے خود انھیں کے دوستوں کی زبانی ملاحظہ کیجیے۔آئی-ایم-ڈی باگیہ لکھتے ہیں:

’’نئے لکھنے والے پیدا کرنا ان کے ذوق ادب میں داخل تھا، تازہ بیان شاعروں اور نوجوان مضمون نگاروں کو کافی بڑھاوا دیتے‘‘۔۳۲

منظور الحق خاں منظور صاحب لکھتے ہیں کہ انور مرحوم اکثر کہا کرتے تھے کہ:

''میری دلی خواہش ہے کہ برما میں اردو زبان کے اچھے اچھے شاعر، مضمون نگار اور ادیب پیدا ہو جائیں، اور شاید یہی وجہ تھی کہ وہ ہر نئے لکھنے والے کی بھرپور اور خاطر خواہ ہمت افزائی کیا کرتے''۔۳۳؎

سیف الدین شاہد صاحب کچھ اور کھل کر کہتے ہیں کہ:

''برما میں آج جو چند ایک اچھے شاعر و ادیب نظر آتے ہیں، یہ سب انور مرحوم ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے یہاں کی ادبی دنیا کو بدل کر رکھ دیا، لکھنے والوں کو نئے نئے موضوعات دیے۔ اچھوتے انداز اور جدّتِ طبع سے روشناس کرایا۔ نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کی، اور بلا تامل ان کے مضامین نظم و نثر کی خوب خوب اشاعت کی۔ اصلاح کے ذریعہ انھیں جدید تقاضائے ادب سے ہم آہنگ کیا''۔۳۴؎

ابوبکر آزاد صاحب خود اپنی بات تحریر فرماتے ہیں کہ:

''مجھے کتابت کا اتنا شوق نہ تھا جتنا ترجمہ کا، چنانچہ موصوف ہی کے نیک مشوروں اور ہمت افزائیوں نے مجھے اس قابل بنایا ورنہ میں کیا تھا، کچھ بھی تو نہیں، مولانائے مرحوم کا مجھ پر یہ عظیم احسان ہے جس کا شکریہ نہ تو میں ادا کر سکا اور نہ ادا کر سکوں گا۔ وہ یہ کہ میرا قلم بہت کمزور تھا لیکن انھوں نے اس کو بہت کچھ پختہ بنا دیا''۔۳۵؎

کلام کوکب کی جمع و ترتیب

شعر و شاعری سے لگاؤ اور ادب پسندی کا ذوق انھیں کم عمری ہی سے تھا۔ اسی دور کا ایک اہم کام جو انھوں نے بڑی محنت و لگن سے انجام دیا تھا وہ کلام کوکبؔ کی جمع و ترتیب کا کام تھا۔ کوکب مرحوم خود ان کی بستی کے ایک جواں سال، خوش ذوق، بالغ نظر شاعر تھے، انور اعظمی کے چھوٹے بھائی راشد اعظمی کا کہنا ہے کہ میں ان دنوں بہت ہی چھوٹا تھا اور اس بات سے بالکل نابلد تھا کہ شعر و شاعری کیا چیز ہوتی ہے، مگر مجھے اب تک حفظ ہے کہ بھائی انور ان دنوں صبح سے شام تک ایک بیاض میں کاغذ کے بے شمار

چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے کچھ نقل کیا کرتے اور اپنے اس کام میں وہ اس طرح محو ہوتے کہ انھیں گردو پیش کا ہوش تک نہ رہتا۔ پھر یہ مجھے بعد میں ہی معلوم ہوا کہ وہ کوکب مرحوم کا کلام تھا جسے انھوں نے بڑی ہی محنت اور جستجو کے بعد جمع کیا اور ترتیب دیا تھا۔

ادارہ ادب اسلامی سے تعلق

انور اعظمی صاف ستھرے ذوق ادب رکھنے کے ساتھ ادب کے بارے میں ایک خاص تعمیری نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ اور وہ تھا اسلامی نظریۂ ادب۔ اسلامی نظریۂ ادب کی بات کبھی تو ادبی دنیا میں ضرور ایک عجیب سی بات لگتی تھی مگر اب ایسا نہیں ہے۔

دنیائے ادب میں اس بحث کا اٹھنا اور اس بات کا قبول عام حاصل کر لینا کہ ادب وہ نہیں ہے جو انسان کے لیے فضول، وقت گذاری اور وقتی طور پر لذتِ ذہنی و تسکین تفریح پسند کا سامان و ذریعہ بن کر رہ جائے، بلکہ ادب وہ ہے جو حیات و کائنات سے متعلق بحث کر کے عام افادی نقطۂ نظر سامنے آئے اور تعمیری قدروں کو اُجاگر کرے، خود اس بات کی دلیل ہے کہ روئے زمین پر بسنے والے مختلف انسانی گروہ ادب میں مخلصانہ و دیانت دارانہ طور پر اپنے اپنے رجحانات و نقطہ ہائے نظر پیش کریں تا کہ زمانہ اپنی بے لاگ کسوٹی پر پرکھ کر ان کا کھرا کھوٹا ہونا ثابت کر سکے اور اس خیال کی تاریخ گواہ ہے کہ ایسا ہوا بھی۔

عالم کے مختلف ''ازموں'' کی طرح اسلام بھی اپنے ایک ''ازم'' ہونے کا مدعی ہے اور حیات و کائنات سے متعلق اپنا ایک مخصوص تعمیری نقطۂ نظر رکھتا ہے، جہاں مختلف ازموں نے بنام تعمیر اپنے اپنے نقطۂ نظر کو ادب کے ''لباس مجاز'' میں عالم انسانی کے سامنے رکھا وہیں اسلام کا تعمیری نقطۂ نظر بھی ہر دور میں ادب کے اندر پیش کیا گیا ہے، مگر بدقسمتی یہ ہے کہ اس مرتب و مکمل صورت میں یا تو سمجھا نہ گیا یا سمجھ کر جیسا کہ چاہیے تھا اس کی ''وکالت'' نہ کی گئی، اور اس بدقسمتی میں مزید اضافہ اس بات سے ہوتا ہے کہ ان فکری بنیادوں پر کوئی منظّم و مستقل تحریک چلائی نہ جا سکی۔

صورت حال کے اس تجربہ و مشاہدہ نے جن پاکباز نوجوانوں کے سینے میں اس احساس کو ابھارا کہ دنیائے ادب میں اسلامی افکار ایک منظّم و مستقل تحریک کے روپ میں لائے جائیں اور ان کی بہر

صورت ''وکالت'' کی جائے انھیں خوش نصیبوں میں انور اعظمی بھی تھے۔ یہ تحریک ان کی آنکھوں کے سامنے عالم وجود میں آئی اور وہ اس میں روز اول سے شریک رہے، نہ صرف شریک رہے بلکہ ہندوستان کی حد تک وہ اس تحریک کے صف اول کے قلم کار و دانشور شمار کیے جاتے رہے۔

اس تحریک کا ''قلمی مجاز'' یعنی اس کے اخبارات و رسائل اس بات کے زندہ گواہ ہیں کہ انور اعظمی نے تا حیات بھرپور عزم و حوصلہ سے دادِ شجاعت دی اور اس ''فکر'' کی کھل کر ''وکالت'' کی۔

بہرصورت یہ حقیقت اس تحریک کے اور دوسرے معماروں کی طرح انور کی نگاہ میں بھی روز اول ہی سے رہی کہ اگر اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات کا نام ہے اور وہ بادشاہت کا ایک پرامن، منصفانہ و عادلانہ نقطۂ فکر رکھتا ہے تو اسے ادب میں پیش کیا جانا چاہیے اور مخلصانہ طور پر ادب میں اسلامی نقطۂ نظر کو ابھار کر لادینے اور لاتے چلے جانے کی ضرورت ہے آخر جب اور بہت سے لوگ محض ظاہر فریب فسانوں کو حقیقت کا روپ دینے سے نہیں چوکتے تو ہمیں کیوں ''حقیقتوں'' کو افسانے کا الزام لگ جانے کے خوف سے چھپاتے پھریں۔

قیام مکتبہ کا خواب

انور اعظمی مرحوم زندگی بھر ایک معیاری ادبی مکتبے کے قیام کی آرزوئے ناکام میں تڑپتے رہے۔ ایک ایسے مکتبہ کے قیام سے ان کے پیش نظر کوئی تجارتی منصوبہ یا مقصد نہ تھا بلکہ ان کی دلی خواہش تھی کہ اس کے ذریعہ اسلامی افکار کا ایک ایسا نمائندہ ادب دنیائے ادب میں پیش کیا جاسکے جو زمانے کی بے لاگ کسوٹی پر گھس کر اپنا ''کھرا'' ہونا ثابت کردے۔

ان کا خیال تھا کہ ستم زدۂ حالات، قافلۂ انسانی، گم کردہ راہ سہی، مگر نرا اندھا نہیں، سرابوں کے پیچھے بھاگتے بھاگتے اگر اسے واقعی چشمۂ حیواں کا سراغ مل جائے تو بھی خواہ مخواہ وہ اسے سراب ہی تصور کرنے کی حماقت کرے گا۔ ایسا ضرور ہوگا اور ہو کر رہے گا کہ وہ اپنی تشنہ کامی کا علاج اسی کو گردانے اور اس کے کنارے اپنا ڈیرہ ڈال دے۔ یہی وہ یقین تھا جس نے انور کو سراپا اضطراب بنا رکھا تھا۔ اور وہ اکثر حسرت زدہ لہجے میں کہا کرتے تھے کہ کوئی ایسی سبیل نکل سکتی کہ ہم ایک مکتبہ قائم کر سکتے اور دنیا کے

سامنے اپنا اعلیٰ ومعیاری ادب لا سکتے۔

جہاں تک مکتبہ قائم کرنے کی بات تھی وہ چاہتے تو اور دوستوں کی طرح قائم بھی کر لیتے مگر وہ اس پیش آمدہ انجام کے لیے قطعاً تیار نہ تھے جواب تک اس سلسلے میں سامنے آ رہا تھا کہ پرچہ نکلا تو چند ایک مہینوں یا سالوں میں بند ہو گیا۔ اشاعتی پروگرام چلے تو دو ایک کتابچوں پر ٹھپ ہو کر رہ گئے۔ اس کے برعکس وہ اپنے ذہن میں ایک جامع وسیع اور ٹھوس اسکیم رکھتے تھے تاکہ جب کام کی ابتدا ہو جائے تو وہ اپنی انتہائی منزل تک کامیابی سے پہنچ سکے۔

''انوار'' حیدرآباد جن دنوں مالی مشکلات کا شکار ہو کر بند ہوا۔ اور اس کے مدیر دفتر سمیت لکھنؤ منتقل ہو گئے تو انور اعظمی نے کوثر اعظمی کو رام پور سے خط لکھا کہ تم فوراً اصغر علی عابدی صاحب سے لکھنؤ جا کر ملو اور معاملات طے کر کے ''انوار'' کو لے لو۔ یہ بھی دراصل انور اعظمی کی اسی دیرینہ تمنا کا ایک اظہار بے اختیار تھا جس کا تذکرہ انہوں نے اپنے رفیق کوثر اعظمی سے کیا تھا۔

ہندستان کے علاوہ انور اعظمی نے برما میں جو ادبی خدمات انجام دی ہیں اور جن کا ایک ہلکہ ساخا کہ ہم پچھلے صفحات میں پیش کر آئے ہیں۔ منجملہ ان کے انور اعظمی کے ذہن سے یہ خیال وہاں بھی محو نہ ہو سکا اور وقتاً فوقتاً اس کا اظہار ہوتا رہا۔ ان کے عزیز دوست شاعر برما حضرت احمر صاحب رنگونی کہتے ہیں کہ:

> **''ایک دن انور بڑی حسرت سے کہنے لگے، احمر صاحب کیا اچھا ہوا گر یہاں سے ایک ادبی ماہنامہ نکلے۔ عہد حاضر کے ادبی تقاضوں کے مطابق اور بلند معیار'' اس کے بعد احمر صاحب لکھتے ہیں کہ میں نے انور سے جواباً عرض کیا: ''انور صاحب خیال تو اچھا ہے مگر میں نہیں سمجھتا کہ ہم دونوں یہاں کے ادب کش ماحول میں ایسا معیاری رسالہ نکال سکیں گے''۔ اور پھر احمر صاحب اس پر اپنے تأثر کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں: ''بات کام کی تھی اس لئے یاد رہ گئی اور اب تک اس کو یاد کر کے دل رو رہا ہے''۔ ۳۶؎**

انور عقیدت ومحبت کے سنگم

انور کے کردار کی یہی وہ مخلصانہ جھلکیاں ہیں جس نے ایک زمانے کی نگاہوں کو اپنے منظر دل فریب میں جذب کرلیا تھا اور وہ دور ونزدیک اپنے حلقۂ تعارف میں ایک بڑے ہی پیارے اور محبوب انسان تھے۔دوست تو خیر دوست ہی تھے اور ان پر جان چھڑکنے والے غیر بھی ان کی صلاحیتوں کے قدردان اور ان کے اخلاق فاضلہ کے معترف۔جو بھی ان سے ایک بار ملا ان کا گرویدہ بن کر رہ گیا۔بات بھی یہ تھی کہ وہ اپنے مختصر سے ہیولے میں ایک عظیم دل نواز و مسحور کن شخصیت سموئے ہوئے تھے۔

کہتے ہیں کہ برما میں کسی اور ہندستانی کو انور جیسی محبت وعقیدت کی مرکزیت حاصل نہ ہوسکی۔ایک زمانہ میں بدرالدین اصلاحی صاحب جب وہ برما میں قیام پذیر تھے اپنی بے پناہ وخداداد علمیت کے واسطے محبت وعقیدت کا مرکز بن گئے تھے۔مگر انہیں بھی اس سلسلے میں وہ عمومیت اور وسعت نہ حاصل ہوسکی جو انور کو اپنے صحافتی کارناموں کی وجہ سے حاصل ہوئی تھی۔انور اعظمی نہ صرف اپنی علمیت وادبیت ،قابلیت واہلیت ،اخلاق ومروت کے لحاظ ہی سے محبوب تھے بلکہ اپنی صالح وصحت مند فکر کے واسطے سے بھی حد درجہ مقبول تھے۔

انور کا بالکلیہ برما کو خیر باد کہہ کر بھارت چلا آنا اہل برما کے لئے کچھ کم حادثہ نہ تھا کہ ایک مختصر ہی عرصہ میں انہیں ان کی وفات حسرت آیات کی خبر سننے کے حادثہ سے بھی دوچار ہونا پڑا۔یہ خبر اہل برما کے لئے قیامت سے کم نہ تھی۔

یہ انور اعظمی کے مقام شہرت وعزت ،نسبت ونا موری اور ہر دل عزیزی ہی کا کرشمہ تھا کہ ان کی وفات کی خبر پر پورا شہر رنگون اور جہاں جہاں تک ان کا حلقۂ تعارف پھیلا ہوا تھا۔سب ان کے غم میں سوگوار ہوگئے۔اس کا اندازہ اس وقت کے برمی اخبارات سے ہوتا ہے جو کہ ''کوثر اعظمی صاحب کے یہاں محفوظ ہیں'' کہ لوگوں نے کس کس انداز سے انور اعظمی کے ساتھ اپنی محبت وعقیدت کا اظہار کیا اور کن کن لفظوں اور صورتوں میں انہیں خراج تحسین پیش کرکے اپنا درد دل بیان کیا ہے۔

اخبارات نے اپنے اپنے خاص نمبر (انور نمبر) نکالے۔انجمنوں اور اداروں نے اپنے مخصوص اجلاس منعقد کئے۔ائمہ مساجد نے اجتماعات منعقد کئے ،شعراء نے مشاعرے کئے اور یوں ہر طرح سے

سب نے اپنے جذبات عقیدت وغم دل کا اظہار کیا اور اس کا سلسلہ مہینوں چلتا رہا۔

اس سلسلے کے چند ایک تائثرات جن کا اظہار ان کے حلقۂ تعارف نے کیا لائق ملاحظہ ہیں۔

ابوبکر آزاد صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''مادر گیتی ہر دور اور ہر زمانے میں ایسی ہستیوں کو جنم دیتی رہی ہے جنھوں نے بڑے انہاک اور خاموشی سے افراد اور اقوام کے کردار کو سنوارنے کی کوشش کی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے اصول پر قائم رہی۔ ایمان داری، دیانتداری اور اعلیٰ کردار کو نمونہ بنا کر پیش کیا۔ حضرت مولانا انور علی رحمۃ اللہ علیہ بھی ان ہی ہستیوں میں ایک تھے'' ۳۷؎

قاسم سلیمان صاحب کہتے ہیں:

''......موصوف کے اس بلند کردار و اعلیٰ اخلاق کے سبب ہم ان کے وطن سے کوسوں دور رہتے ہوئے بھی ان کی موت پر آنسو بہا رہے ہیں'' ۳۸؎

نظیر دریا آبادی صاحب لکھتے ہیں:

''بزم ہستی میں روزآنہ کتنے ہی وجود کالعدم ہوجاتے ہیں اور جانے کتنے عدم سے وجود میں آتے ہیں مگر ہر صدف میں گوہر آبدار نہیں ہوتا۔ آہ انور تم ہمیں برسوں یاد آؤ گے۔'' ۳۹؎

مقالہ نگاری

مقالہ نگاری نثر کی ایک صنف کی حیثیت سے دور جدید میں رائج ہوئی۔ ان معنوں میں مضمون کا استعمال سب سے پہلے سر سید نے کیا۔ اس کا نمونہ وہ مضامین ہیں جو ان کے رسالہ تہذیب الاخلاق میں شائع ہوئے۔ جو موضوعات کے اعتبار سے تعلیم و تربیت، مذہب اور اصلاح رسوم، شاعری، ادب، انشاء، سیاست، تاریخ غرض انسانی زندگی کے متعلق سارے اہم موضوعات پر مضامین لکھے جاتے تھے۔ ان سب کا مقصد قوم کی اصلاح کی تجاویز تھیں۔ اس کے بعد اردو کا اہم رسالہ مخزن،، ہے جس کے ایڈیٹر سر عبدالقادر تھے تہذیب الاخلاق کی طرح یہ بھی محض ایک رسالہ نہیں بلکہ تحریک ہے سر عبدالقادر کو مشرقی

روایات سے بڑی ہمدردی اور محبت تھی۔ وہ مسلمانوں کے شاندار ماضی پر فخر کرتے تھے اور ان کے اتحاد کے علمبردار تھے، ان کے مضامین اسی میلان اور رجحان کے علمبردار ہیں۔

بحیثیت مقالہ نگار انور اعظمی کے یہاں زیادہ تنوع ہے انہوں نے مذہبی موضوعات کے علاوہ تاریخی مضامین میں مسلمانوں کے علمی کارناموں کا جائزہ لیا ہے۔ انہوں نے اپنے تعلیمی مقالات میں خاص طور پر مسلمانوں کے نظام تعلیم کا جائزہ لیا ہے۔ ان کے علاوہ انہوں نے خالص ادبی موضوعات سے متعلق بھی مضامین لکھے ہیں جن لوگوں نے ان کے دور طالب علمی اور بعد کے قلمی جرائد ہفت روزہ ''تسنیم'' ماہنامہ ''کارواں'' کے مقالات دیکھے ہیں انہیں اس کا بخوبی اندازہ ہے جب کہ انہوں نے ان مقالات و بحثوں کے ذریعہ اپنے گردوپیش میں ایک ہلچل مچادی اور مخالف وموافق ہر فرد کو متاثر کر کے چھوڑا۔ حتیٰ کہ مدرسہ کے اندر انہیں ایک خوش آئند تبدیلی لادینے کی مطلوبہ مہم میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔

رسالہ، زندگی کے دور ادارت میں انہوں نے عمرانیات سے متعلق ایک سلسلہ مضامین نظم اجتماعیت کی بحث پر مشتمل،، فرد اور اجتماعیت،، کے عنوان سے سپرد قلم کیا تھا یہ بحث اگر چہ بدقسمتی سے ان کے فکری خاکے کے مطابق پایۂ تکمیل تک نہ پہونچ سکی پھر بھی انہوں نے اسکا جتنا حصہ لکھ دیا وہ ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے اور اہل علم طبقہ سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے۔

افسانہ نگاری

افسانہ کیا ہے اور کس طرح لکھا جاتا ہے؟ اس پر تو ماضی میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور حال کے صفحات پر بھی اکثر اہل قلم اپنی جولانی طبع کے جوہر دکھارہے ہیں لیکن درج ذیل سطور میں جس قسم کے افسانے کا ذکر موجود ہے اس سے ہماری علمی اور ادبی دنیا کا ایک حصہ ابھی ناآشنا ہے۔ یا اگر آشنا ہے بھی تو اس قدر انجان جیسے کوئی سانپ سونگھا ہوا انسان بستر پر دراز ہو اور یہ معنی خیز یا بے معنی، بے خبری جو کچھ بھی ہو اب ختم ہو جائے اور اس کے برخلاف ایک ہوشمندانہ حق آگاہی اور ایک مجنونانہ حق گریزی پیدا ہو تا کہ جس شخص میں بھی حق پسندی کا عنصر موجود ہو وہ سمٹ کر ایک ہی نقطہ پر آجائے اور پھر تمام صالح عناصر مل کر غیر صالح عناصر کی ادبی شیرازہ بندی کو بکھیر دیں، نئے ادب کا سورج اپنی انتہائی جوت کے

ساتھ طلوع ہو اور جاہلی ادب کے دیئے اس کے آگے ٹمٹما کر رہ جائیں اسی نئے ادب کی ایک کڑی انور اعظمی بھی ہیں جنہوں نے مقصدیت سے پر نئے نئے افسانے لکھے۔

انور اعظمی افسانے کے ساتھ ساتھ ڈرامے بھی لکھ لیتے تھے اور اچھا لکھتے تھے پہلے تو ابن مختار اور پھر انور اعظمی کے نام سے۔ افسانہ نگاری میں ان کا انداز اپنے پیش رو پریم چند کا سا ہوتا لیکن اس میں بھی ان کی ایک خاص انفرادیت ہوتی جو بڑی دلکش اور دل آویز ہوتی۔ وہ جو کچھ لکھتے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کافی مطالعہ کے بعد لکھ رہے ہیں مقصدیت پلاٹ کے ساتھ اچھا میل کھاتی ہے۔ نتیجہ دلچسپ اور اچھا نکالتے ہیں شروعات میں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے قصہ میں کوئی مقصد نہیں ہے، بے مقصد واقعات بھر دیئے گئے ہیں خواہ مخواہ کی گفتگو ہے بیجا لعن طعن ہے، نفسیات انسانی غیر ضروری سا تجزیہ ہے لیکن آخر میں جب وہ کانٹے کی بات آجاتی ہے جس کی خاطر افسانہ لکھا جاتا ہے تو پورا افسانہ ایک باقاعدہ عمارت، ایک بامقصد کام اور ایک خاص غرض کے لیے پہلے سے مرتب شدہ شکل اختیار کر لیتا ہے اور افسانے کی ایک ایک کڑی پکار پکار کر کہتی ہے کہ وہی بات ٹھیک ہے جو سب کے آخر میں کہی گئی ہے یہ خصوصیت ہندوستان میں اچھے اچھے لکھنے والوں کو میسر نہیں۔ معلوم نہیں انور اعظمی اسے کہاں سے مستعار لے لئے ہیں۔ در اصل جب ایک اعلی مقصد کے لیے انسان اپنی ادبیت کو ڈھالتا ہے جو اس اعلی مقصد سے فطری لگاؤ رکھتی ہے زیادہ سے زیادہ اس کے قلم میں کھنچ کر چلی آتی ہیں اس کے برعکس ایک جاہلی ادب میں معیار کی بلندی اول تو بڑی دیر میں آتی ہے اور جب آتی ہے تو کراہتی ہوئی اور ڈرتی ہوئی جیسے کوئی کم سن لڑکا ڈرا سہما آپریشن روم کی طرف جا رہا ہو۔

انور اعظمی کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے آس پاس کے ماحول سے کبھی نہیں ہٹے زیادہ تر وہ اسی گاؤں کے سماج کو ہمارے سامنے رکھتے ہیں جس میں کہ وہ رہتے ہوں لیکن اس کے باوجود ان کی تصویر کشی میں وہ بدمزگی نہیں جو عموما دیہاتی سماج کا نقشہ کھینچتے وقت اشترا کی ادیبوں کے قلم سے ظاہر ہوتی ہے۔ اور اس کی وجہ صرف یہی ہوسکتی ہے کہ ان کی نظر اعلی تر اقدار پر زیادہ جاتی ہیں اور اشترا کی ادیب ادنی حیوانی اقدار کے اعتبار سے زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں ''بقدر وسعت'' اس طرز کے افسانوں میں

شاہکار کہا جاتا ہے لیکن ''بقدر وسعت'' میں ایک بات ہے مقصد کے اعتبار سے تو افسانہ کامیاب ہے مقصد بجائے خود ہلکا ہے ضرورت تو اس امر کی تھی کہ مقصد زیادہ زوردار ہوتا، صرف اسلامی ہی نہیں بلکہ انقلابی ہوتا چنانچہ ''پاگل'' میں یہی بات ہے کہ مقصد کافی زوردار ہے۔

گاؤں کی زندگی کا نقشہ وہ بڑی چابکدستی سے کھینچتے ہیں۔ ''کسانی'' میں شہری زندگی کی جھلک بہت اچھی دکھائی ہے اور شہری و دیہاتی کا وہ میلاپ بھی کس قدر پرلطف ہے جب دیہاتی کے استفسار پر شہری بابو ''ہش فش'' کہہ کر چلتا بنتا ہے لیکن دیہاتی سمجھتا ہے جیسے اس نے کوئی اہم بات کہی ہے جسے وہ اپنی حالت کی وجہ سے سمجھ نہیں سکا۔ یہ نفسیاتی جائزہ منظر کشی اور واقعات میں فطری ربط نہیں معلوم یہ سب کچھ وہ کہاں سے لا رہے ہیں۔

انور اعظمی کے افسانوں کی تعداد لگ بھگ بیس ہے جو کہ ان کے زمانے میں مختلف رسالے اور میگزین میں شائع ہوئے ان کے نام یہ ہیں۔ ''جوتا''، ''یکسانی''، ''کھلونا''، ''آزادی کے بعد''، ''جس پر نگاہ پڑ گئی''، ''راول''، ''بقدر وسعت''، ''اپنی دنیا''، ''ڈوپٹہ کا پھندا''، ''گرہن''، ''سرپنچ''، ''ہیرو''، ''اقتدار''، ''بے آسرا''، ''مہرو''، ''پاگل''، ''ابھار''، ''بیل''، ''چراغ کیوں جلے''، ''مزدور''، ''فیصلہ کن'' وغیرہ ان افسانوں کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ وقت کے رواں دواں ادب کے خلاف ایک طاقت ور بغاوت تھے۔ نئے انقلابی مقاصد کے اعتبار سے ان میں طرز نگارش کی جدت پوری طرح نمایاں ہے ان کی تشبیہوں اور استعاروں میں تازگی ہے تکنیک میں ارتقائی رجحان اور نئے مواد کے لیئے سانچوں کی طلب کا جذبہ کافی نمایاں ہے گویا نیا مقصدی ادب اپنی تکمیل کے لیئے ایک سازگار فضا خود ہی تیار کر رہا ہے افسانہ نگار عام راستوں سے ہٹ کر ایک نیا راستہ اختیار کرتا دکھائی دے رہا ہے۔

مجموعی طور پر ان کے افسانے مقصدی اعتبار سے اصلاحی و تعمیری ہوتے ہیں اور وہ ان کے ذریعہ اجتماع و معاشرہ کی دکھتی رگوں پر انگلیاں رکھتے ہیں اور پھر ایسے فطری اور نفسیاتی گوشوں سے حقیقت حال کو ابھار کر سامنے لاتے ہیں کہ قاری کا ذہن مسحور ہو کر رہ جاتا ہے اور اسکی نگاہ کے سامنے جو کچھ ہے اس کے نہ ہونے اور جو نہیں ہے اس کے ''ہونا چاہیئے'' کی بات آپ سے آپ آجاتی ہے اور یہی افسانوں

میں انور کے فن کا کمال ہوتا ہے

خطابت

انور اعظمی بنیادی طور پر ایک عالم دین تھے ان کے عہد میں علماء دین اور بھی بہت تھے لیکن انکے اور دوسرے ہم عصر علما کے درمیان بہت ہی واضح فرق ملتا ہے، اور یہ فرق بہت آسانی سے محسوس کیا جا سکتا ہے، یہ فرق نقطہ نظر کا فرق ہے، کیوں کہ وہ ایک افتاد طبع اور تخلیقی ذہن کے مالک تھے، اعظمی کے یہاں قرآن حکیم تمام علوم کے سرچشموں کی حیثیت رکھتا ہے، انہوں نے عربی فارسی اور اردو زبان کی ادبیات کا گہرا مطالعہ کیا تھا کہ یہی زبانیں ان کے اظہار کا وسیلہ تھیں۔ تاریخ عالم اور اقوام عالم کے دور جزر اور عروج و زوال، مذاہب اور بانیان مذاہب کی سرگزشت، مفکرین عالم کے خیالات دنیا کی سیاست و قیادت کے پیچ در پیچ زاویے ان کے ذہنی پس منظر میں محفوظ تھے، انہوں نے قرآن اور اسلام کے مطالعہ اور ان پر غور وفکر میں وقت صرف کیا تھا، وہ عربی زبان و بیان کے مزاج داں تھے یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم کو عالم انسانیت کی ہدایت و رہنمائی کے لیے مشعل راہ پایا اور اسے بنی نوع انسان کے ورثے کی حیثیت سے ہی سمجھا، انہوں نے قرآن حکیم کا مطالعہ بھی انسانیت کے مسائل کے تناظر میں کیا۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے ان کی خطیبانہ صلاحیت ابھر کر لوگوں کے سامنے آئی ہیں

شاعری

جس میدان میں انور اعظمی کا جوہر قابل سب سے زیادہ چمکا وہ ان کی شاعری کا میدان ہے، ان کی شاعری درس و پیام ہے، انھوں نے شعر جیسے نازک فن میں بھی اپنے افکار و خیالات کو پوری دلکشی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

انور اعظمی شعر و شاعری کے سلسلہ میں علامہ اقبال سہیل سے قریب رہے اور حتی المقدور ان سے استفادہ کیا، اسی طرح اپنے شفیق استاد نور الہدیٰ اصلاحی صاحب سے وسیع اور گہرے تعلقات استوار کیے، مولانا موصوف اردو اور فارسی کا عمدہ ذوق رکھتے تھے اور خود بھی ایک اچھے شاعر تھے، چونکہ انور اعظمی کو طالب علمی ہی کے دور سے شعر و شاعری سے خاص لگاؤ تھا، اس لیے وہ ان سے بہت قریب اور غایت درجہ

بے تکلف ہوگئے، انور اعظمی کو نظم و نثر میں یکساں قدرت حاصل تھی، لیکن ان کا جوہر صلاحیت سب سے زیادہ جس میدان میں چمکا وہ شاعری کا میدان ہے، ان کی شاعری اپنے موضوعات کے اعتبار سے مختلف النوع ہے، مگر بنیادی فکر مقصدی اعتبار سے اسلام کے عظیم، مکمل و جامع نظریۂ حیات پر مبنی آفاقی قدروں کی حامل ہے، انور اعظمی کی شاعری اپنے عناصر ترکیبی اور بنیادی قدروں کے اعتبار سے ایک مکمل تعمیری و آفاقی شاعری کی میزان پر پوری اترتی ہے، وہ شاعری کو نہ تو وقتی تفریح کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور نہ ہی ذہنی عیاشی و لفظی بازی گری کا مشغلہ۔ جس کا مقصد فی الاصل ہنسنے ہنسانے اور وقتی مسرت کے سوا اور کچھ نہ ہو چنانچہ ادب میں ایک ایسی صورت حال کے بارے میں ماتم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ملتِ اسلام کی شریان کو
ہے ضرورت گرم و تازہ خون کی
اور یہ فکر و ادب کی محفلیں
بانٹتی ہیں گولیاں افیون کی ۱۴۰

انور اعظمی کے نزدیک شعر و شاعری ایک ایسی کاوش کا نام ہے جس سے قوم کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو جائے اور قوم کے اندر انقلاب و بیدار کی لہر و جذبات مشتعل ہو جائیں، اور شعر و سخن کی وہ تمام کاوشیں جو غیر نتیجہ خیز ہوں اور قوم و ملت کو اپنے مقصد زندگی سے دور کر دیں وہ کار عبث کے سوا کچھ نہیں، شاعری کو ایک اعلیٰ و ارفع اور عظیم تر مقصد کے حصول کا ذریعہ گردانتے ہیں اور اسے ''سوز سخن'' کا نام دیتے ہیں۔

مجھے آداب محفل سے شکایت
گلہ مجھ سے ہے میری انجمن کو
مرے بادل نہیں بجلی سے خالی
چھپاؤں کس طرح سوز سخن کو ۱۴۱

اور یہی جوہر ''سوز سخن''، انھیں پر امید رہنا سکھاتا ہے مایوسی کو وہ کفر ہی نہیں بلکہ ادیب کی موت

تصور کرتے ہیں، وہ بے مقصد شاعری کے مخالف ہی نہیں بلکہ ایسی شاعری سے احتراز ضروری قرار دیتے ہیں اور ایسی شاعری سے منع کرتے ہیں جو رجائیت کے بدلے یاس وقنوط کی دعوت دے۔

نوا سنجی سے بہتر ہے خموشی
جو مایوسی ہو سرمایہ سخن کا

توقع پھر ہنر مندوں سے کیا ہو
اگر لیں کام پرچم سے کفن کا

چھپا چھپا کے نہ رکھ ان جگر کے داغوں کو
انھیں ستاروں سے اک آفتاب پیدا کر

نہ ہو سکے، تو شکایت نہ کر زمانے کی
جو ہو سکے تو کوئی انقلاب پیدا کر ۴۲؎

انور اعظمی کا جہانِ آرزو ''دورِ محبت'' ہے جسے وہ اپنی شعری زبان میں وحدت آدم سے تعبیر کرتے ہیں، پھر اس وحدت آدم کی مستند بنیاد وہ وحدت الٰہی کو گردانتے ہیں۔

ہے خبر کچھ تجھ کو اے مرغ حرم اس راز کی
ہے فقط توحید سے قوت پرواز کی ۴۳؎

وحدت الٰہ کی بنیادوں پر ابھرنے والے وحدت آدم کے دلآویز خاکے میں انھیں ایک لازوال سرمدی سکون بخش، فردوس صفت حیات انسانی کا روپ دکھائی دیتا ہے۔ وہ اسی روپ کے دیوانے ہیں اور زمانہ کو اسی روپ جلوۂ راز میں تبدیل کر دینا چاہتے ہیں۔ تبدیلی کی اس مہم میں اپنا سب کچھ لٹا دینا ایک ادیب کا منتہائے نظر اور اس کا فکری مشن ٹھہراتے ہیں جسے وہ ''شرع وحدت آدم کی تجدید'' سے موسوم کرتے ہیں۔

کمال درد محبت ہے وحدت آدم
بنائے وحدت آدم الٰہ کی توحید

ترا پیام کبھی عام ہو نہیں سکتا
کہ شرع وحدت آدم کی ، کی نہیں تجدید ۴۴؎

صرف یہی نہیں کہ شرع وحدت آدم کی تجدید کے بغیر کوئی پیام عام نہیں ہوسکتا بلکہ دراصل سرے سے وہ کوئی پیام ہی نہیں ہوتا، اس انتہائی وسیع المشرب نقطۂ اساس کے علاوہ اور بھی جس شے کو بنیاد بنایا جائے اس سے یہ تو ہوسکتا ہے کہ بعض حالات واسباب کے تحت ایک مخصوص انسانی حلقہ کو دلچسپی وعلاقہ ہو مگر بین الانسانی پیمانے پر اسے وسیع قبولیت عام کا درجہ ہرگز حاصل نہ ہو سکے گا بلکہ یہی بنیاد، بنیاد تفریق بین انسانی کا موجب اور امن عالم کے لیے تباہ کن ثابت ہوگا، وہ قومیت ہو، رنگ ونسل کا امتیاز ہو یا کوئی بھی مخصوص تہذیبی وجغرافیائی تصور، وحدت آدم کے نظریہ کی نفی کر دینے والا ہی ثابت ہوگا، یہی وجہ ہے کہ انور اعظمی ان مختلف بنیادوں پر کھل کر تیشۂ نقد چلاتے ہیں اور تردیدی شاہ ضرب لگاتے ہیں کہ اس کے بغیر چشم عالم کا اضطراب جاتا نہیں اور حسن وحدت کا نکھار سامنے آتا ہے۔ کہتے ہیں:

وحدت آدم کو پارہ کر گئے قوم و طن
ظلم انسان سے سجایا خون سے انسان کا کفن
سرو کا سنبل مخالف، یاسمیں کی نسترن
مختلف رنگوں سے ٹوٹی وحدت حسن چمن
ساری آنکھیں مضطرب ہیں وحدت آدم کے لیے
رحم و ہمدردی ، وفا، مہر و محبت کے لیے ۴۵؎

توحید کی حقانیت بیان کرنے کے بعد شرک کی آلائشوں اور اس کے نقصانات اور اقسام شرک پر بھی روشنی ڈالتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ شرک کا اصلاً فطرت انسانی اور نظام کائنات دونوں کے خلاف ہیں۔

نظام انفس و آفاق اس پہ شاہد ہے
کہ شرک فطرت انسان سے سازگار نہیں
کمال غیرت انسانیت کی آنکھوں میں
دوئی پسند طبیعت کا اعتبار نہیں ۴۶؎

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے جس دین کو پسند کیا وہ اسلام ہے اور اسلام محدود فکر کا نام نہیں ہے، وہ مسجد میں مقید نہیں بلکہ وہ دولت عام ہے۔

کہتے ہو کہ اسلام سیاست سے جدا ہے
پھر زندہ ہیں تاریخ میں کیوں حمص و نہاوند
کچھ بھی نہیں لفظ خلافت کی حقیقت
کس راز کے محرم تھے بخارا و سمرقند
شیطان تو مردود کہ دنیا کو بگاڑے
اسلام کو مسجد میں مگر کسی نے کیا بند ۴۷؎

عالم انسانی کے جملہ اضطرابات سے نجات حاصل کرنے کے لیے وہ ایک ایسے نظام کی ضرورت پر زور دیتے ہیں، جو پوری نوع انسانی کی محبت پر مبنی ہو، اس کے لیے وہ تمام قسم کے تفرقوں کو توڑ دینا اور مٹا دینا ضروری قرار دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ زمانہ قریب میں اقوام عالم کی امامت ایسے ہاتھوں میں ہوگی جو ''حب انسانی کے'' عالم گیر نظریہ کی علم بردار ہو۔

دل میں ہوگا اب اسی پیر مغاں کا احترام
جو پلائے ایک انداز میں محفل میں جام
وہ جماعت ہوگی اب اقوام عالم کی امام
جس سے محکم ہوگا سارے نوع انسانی کا نظام
رنگ و نسل و مغرب و مشرق کی قید توڑ دے
حب انسانی کے لیے ہر ایک محبت چھوڑ دے ۴۸؎

انور اعظمی ایک مذہبی اور صحیح العقیدہ شاعر تھے۔ اللہ رب العزت کے خالق، مالک اور مشکل کشا ہونے پر کامل یقین تھا۔ چنانچہ مصیبت کی گھڑی میں اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو کر دعا اور استغفار، مدد ونصرت طلب کرنے کو ضروری تصور کرتے:

زمانہ پھر اٹھا مجھکو مٹانے

خدایا همت شبیر دینا

مرے دشمن کو ہر ساماں عطا کر

مجھے مولا! مری تکبیر دینا ۴۹؎

لیکن ضروری طلب کی حیثیت ایک درخواست کی ہوتی ہے یعنی آپ دعا کو ایک درخواست سمجھتے ہیں اور کامیابی کے لیئے دعا کو کافی تصور نہیں کرتے بلکہ اس کے لیئے اپنی محنت ومشقت کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ راہ پر خطر ہو، رات تاریک ہو، اس تاریکی میں دور دور تک منزل نظر نہ آتی ہو تو محض دعاؤں سے سحر پیدا نہ ہوگی بلکہ اس کے لیئے سخت محنت اور مشقت کرنی پڑے گی، جسے انہوں نے مجاہد کی اذاں سے تعبیر کیا ہے۔کہتے ہیں:

فضا پر ہے شب تاریک طاری

نگہ میں دھند ہے وہم وگماں ہے

دعاؤں سے سحر پیدا نہ ہوگی

ضرورت ہے مجاہد کی اذاں کی ۵۰؎

ساری تدبیر اور تکبیر آزمانے کے باوجود اگر ناکامی ہی ہاتھ آتی ہے تو دوسروں کو مورد الزام ٹھہرانے کے بجائے اپنے گریبان میں جھانکنے کی دعوت دیتے ہیں:

یہ کیا ہے اے اذاں کے دینے والے!

افق بے گانہ چاک سحر ہے

بتوں کی انجمن برہم نہیں ہے

تری تکبیر شاید بے اثر ہے ۵۱؎

انوراعظمی کا مطالعہ وسیع تھا، انھیں تاریخ اسلام پر بھی کافی عبور حاصل تھا، اردو کے مشہور شاعروں غالب، مومن، فانی، فارسی میں نظیری، خیامی، غنی کاشمیری اور عربی میں امرؤالقیس کے بڑے مداح تھے، ان کی دلی خواہش تھی کہ شعرائے کرام ایسی شاعری کریں جس سے قوم بیدار رہو، انھیں کوئی پیغام ملے، اس سلسلے میں وہ اقبال سہیل، علامہ اقبال سے زیادہ قریب نظر آتے تھے۔اقبال سہیل اور

علامہ اقبال کی طرح ان کے یہاں بھی اسلامی تعلیمات کا اثر بہت زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

آ! سناؤں تجھ کو وہ تیری روایات کہن
سامنے لانے سے ڈرتی ہے جنھیں تیری زباں

وقت کی رو سے وہ طوفان حقیقت کی جھڑپ
ایک تھپیڑے سے وہ باطل کے خداؤں کا زیاں

وہ وقار عشق و پابندی عہد و فا
وہ فسونِ عقل کے شعلوں سے پیدا گلستاں ۵۲

ان کے نزدیک شعر و شاعری کی بزم رنگیں محض تماش گاہ اور زلف و گیسو اور رخ و عارض کی فرسودہ مکاتب نہیں، وہ وقتی تفریح کا سامان ہے، نہ ذہنی عیاشی اور لفظی بازیگری کا ذریعہ جس کا مقصود ہنسنے ہنسانے کے سوا کچھ نہ ہو، بلکہ وہ حیات انسانی کی اقدار عالیہ کی ترجمان ہے، انور اعظمی کی شاعری اپنے عناصر ترکیبی اور بنیادی قدروں کے اعتبار سے ایک مکمل تعمیری و آفاقی شاعری ہے، فرماتے ہیں:

ملت اسلام کی شریان کو
ہے ضرورت گرم و تازہ خون کی

اور یہ فکر و ادب کی محفلیں
بانٹتی ہیں گولیاں افیون کی ۵۳

مغرب جس نظام کو آزادی کا نام دیتا ہے، وہ دراصل آزادی نہیں بلکہ ایک خدا کو چھوڑ کر سیکڑوں خداؤں کی غلامی کی ایک انتہائی کریہہ شکل ہے اس سے انسان کی عظمت داغدار ہوئی ہے:

نشاط خیز ہوں یہ حریت کے ہنگامے
مگر جو ذوق عبادت ظہور کرنا ہے

کبھی وطن، کبھی مزدوریت کے پتھر پر
ریاغ عظمتِ آدم کو چور کرنا ہے ۵۴

پردہ کے اسلامی تصور پر نئے دور کی تنقید پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ظلم عورت پر ہے پردے میں مقید رکھنا
کیوں یہ پابند رہے مرد اگر ہے آزاد
ہیں جو ہاتھ ایک بھی مفلوج ہوا
لازماً آئے گا تعمیر غدن میں فساد
اس نئے دور میں ایک جرم ہے پردے کا رواج
اس پردے سے ہوا جوہر عورت برباد
میں یہ کہتا ہوں کہ بے سود ہے حجت کرنا
شاخ پھیلے گی اگر رہ گئی باقی بنیاد
ہے نئے دور میں خود جرم مجسم اسلام
پہلے فتوی ہو اسی چیز کے بابت ارشاد ۵۵؎

انور اعظمی اشتراکیت پر تبصرہ کرتے ہوئے انصاف، مجرم، حالات اور پریس کا ایک مختصر مگر انتہائی مؤثر مکالمہ پیش کرتے ہوئے آخر میں کہتے ہیں:

دیکھ لی دنیا نے آزادیٔ افکار کی لاش
پڑ گئی سینۂ انصاف پہ ایک اور خراش ۵۶؎

انور اعظمی کی ایک خوبی یہ ہے کہ انہوں نے جس موضوع کو بھی چھیڑا ہے، اسے مختلف نقطہ نظر سے پیش کیا ہے۔ جہاں اس موضوع کے محاسن کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے وہیں اس کے معائب بیان کرنے میں انتہائی جرأت مندی اور بے با کی کا مظاہرہ کیا ہے۔ انہوں نے مصلحت سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا بلکہ دامن حق وصداقت کو مضبوطی سے پکڑے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ''گنگا'' جیسے موضوع پر نظم لکھتے ہوئے بھی یہ کہنے سے نہیں چوکتے:

نسل وقومیت، وطن، جمہور وسلطان وگدا

زندگی کے راز سے پردہ اٹھا سکتے نہیں
زیست کے دریا کی رو سے اپنے ساحل کی طرف
لاخدائی کے جزیرے راس آسکتے نہیں
جس سے سرگوشی غبار ناقہ محمل کرے
وہ بگولہ، یہ ترے مجنوں اٹھا سکتے نہیں ۵۷؎

تاج محل کا شمار دنیا کے عجائبات میں ہوتا ہے۔ یہ عہد سلطنت مغلیہ کی یادگار ہے۔ جب سے تاج محل بنا ہے اس وقت سے اس پر لوگ اپنے اپنے حساب سے مثبت ومنفی تأثرات کا اظہار کرتے ہیں۔ مثبت ومنفی تأثرات واحساسات کے اظہار میں ادباء وشعراء بھی کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ انور اعظمی نے بھی تاج محل کو مختلف زاویوں سے دیکھا ہے اور ان میں بھی آخری زاویہ جو پوری نظم کا حاصل ہے انور کے اسی ایک فکر کا شاہد جمیل ہے:

مایہ دار عشق یعنی امت ختم الرسل
عالم ہستی کی دانائے رموز جز وکل
چہرہ روپوش دل کو جس نے بے پردہ کیا
بزم امکاں میں رموز عشق کو افشا کیا
ذرہ ناچیز کو تاب رخ خورشید دی
قطرہ بے مایہ کو طوفان کی امید دی
خار وگل کے ربط سے پیدا کیا حسن چمن
ہر ہوسناکے نداند جام وسنداں باختن
کار او بر جام فکر وہوش سنگ لازدن
در جہان ذکر ومستی نعرہ الا زدن
مایہ دار از مستی صہبائے وحدت جام او
بر زجاج یار زن پیغام او

دشت امکاں کو غبار کاروان دل کیا
ماسوائے دوست جو کچھ تھا اسے باطل کیا

جس نے دنیا میں عشق کی تعیین کی
کیا اسی نے عشق کے آداب کی توہین کی

دیکھتا ہوں صاف پر دل کو یقیں آتا نہیں
اس طرح چپ ہے نظر جیسے کہ کچھ دیکھا نہیں

کونسا پردہ میں لاؤں چشم بینا کے لیئے
عذر آخر کیا تراشوں لغزش پا کے لیئے

عقل کچھ کہتی ہے دل کا اور ہی پیغام ہے
تاج! تو بھی باعث رسوائ اسلام ہے ۵۸؎

آزاد ہندوستان کی تاریخ میں دو دنوں کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ایک ۲۶ جنوری دوسرا پندرہ اگست۔ان دنوں کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان آزاد ہوا اور ۲۶ جنوری ۱۹۴۹ء کو دستور ہند جمہوری قرار پایا۔واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی آزادی میں ہندوستانی قوم کو جانی و مالی ہر طرح کی قربانی دینی پڑی لیکن وہ خواب شرمندہ تعبیر نہ سکا جس کے لئے یہ عظیم قربانی دی تھی۔آج جو ہندوستان کی حالت ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ہے۔

آج ایوان و دربار آزاد ہیں
دشت و گلزار و کہسار آزاد ہیں

رہزنی، رشوتیں، جھوٹ، عیاریاں — قوم اسفید کی تھیں، سیہ کاریاں
بھوک، افلاس، لٹتی ہوئی عصمتیں — تھیں فرنگی کی لعنت نما برکتیں
فرقہ واری تعصب جہالت کے بھوت — بطن مغرب کے زائیدہ خونی سپوت

آج شب رنگ سائے پگھل ہی گئے

اب تمدن کے سانچے بدل ہی گئے ۵۹؎

شاعری کی ایک قسم مکالماتی شاعری ہے اس صنف شاعری میں کبھی شاعر سوال کرتا ہوا نظر آتا ہے تو کبھی جواب دیتا ہوا نظر آتا ہے۔انور اعظمی کی شاعری میں یہ صفت بھی پائی جاتی ہے بعنوان جمہور نظم میں لکھتے ہیں۔

بھیڑ سے بڑھ کے کسی نے یہ کہا ''او رہ گیر
پوچھنا کچھ ہے خبر دار ! بڑھانا نہ قدم
یہ کہو، کون ہو ؟ کیا نام ہے، کیسے آئے؟
یوں تو مشکوک سمجھتے ہیں بظاہر تمہیں ہم
سن کے رہ گیر نے اک آہ بھری اور کہا
میں ہوں سینا کہ ہے ہستی مری تصویر عدم
یاس کے ہاتھوں سے احساس بھی باقی نہ رہا
ہیں برابر مرے دل کو ، چہ مسرت ؟ چہ الم ۶۰؎

تنقید اور شعر و ادب کا آپس میں اتنا گہرا رشتہ ہے کہ ایک کے بغیر دوسرے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ پہلے ادب وجود میں آتا ہے پھر اسے پرکھنے کے لئے تنقید۔تنقید نگار مختلف زاویوں سے فن پارے کو دیکھتا اور پرکھتا ہے۔وہ فنکار کے ذہن میں اترنے کی کوشش کرتا ہے،فن کار کے عہد اور ماحول کا جائزہ لیتا ہے فن پارے کے وجود میں آنے کے اسباب پر غور کرتا ہے اس کے فنی محاسن کا پتہ لگاتا ہے چنانچہ انور اعظمی کا خیال ہے کہ سنجیدہ اور منصفانہ تنقید ادب کے فروغ میں مدد کرتی ہے۔ادب کے مشکل حصوں کی شرح کرتی ہے قارئین میں ادب کا ذوق پیدا کرتی ہے اس سے فن کو بھی رہ نمائی حاصل ہوتی ہے اسی کے ساتھ انور اعظمی کا خیال ہے کہ ایک ادیب کو بیباک،صاف گو،اور آزاد ہونا چاہئے چند کھوٹے سکوں کے عوض اپنے فن پارے کو نہیں فروخت کرنا چاہئے اور نہ ہی حالات اور ماحول سے کبیدہ خاطر ہو کر بے جا نقد و نظر سے کام لینا چاہئے۔

عشق جب تک خطرۂ نمرود میں پڑتا نہیں
دامن آتش سے جائے شعلہ گل جھڑتا نہیں
جاں سپاری سے ہے فکر وشعر کی کھیتی ہری
اہل ثروت دام مل جائے تو بیچیں دین بھی
فکر رک سکتا نہیں ماحول پر تنقید سے
یہ پنپتا ہے اسی ماحول کی تائید سے
بجلیوں کو پالتی رہتی ہیں جنکی وسعتیں
ان سے تعمیر نشیمن میں مدد ملتی نہیں
فکر پر تجھ کو بھروسہ ہے تو بے باکانہ چل
یہ رہ مستی ہے ساز برگ سے بیگانہ چل
کیوں ہوائے التفات خاطر محفل میں ہے
شمع کی دولت تو پنہاں خود اسی کے دل میں ہے ۶۱

خانقاہوں، مدرسوں اور مسجدوں سے جس طرح زندگی کا گلا گھونٹا جاتا ہے اور افراد ملت کو جس طرح تھپکیاں دیکر سلا دیا جاتا ہے اس کا رونا اس طرح رویا ہے:

خانقاہ، یہ مکتب، یہ منبر و محراب
کہیں حیات کے دھارے رواں نہیں ملتے

بہت لطیف یہ ماحولِ خوش گمانی ہے
کسی طرح کے بھی خطرے یہاں نہیں ملتے ۶۲

مادر علمی کے خدمت میں جو طویل نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے، اس کا ایک ایک شعر محبت و عقیدت اور احترام وتقدس کے کوثر وتسنیم میں دھلا ہوا اور زندگی سے مع مول ایک درس موعظت ہے:

آخر کے چند اشعار ملاحظہ ہو:

ربط باہم سے ہے قائم جس کی ہستی کا نظام
جس کے نغمے ہیں محبت ، آشتی جس کا پیام
کوئی شیوہ شیوۂ تفریق انسانی نہیں
آدمی اس میں کہستانی، بیابانی نہیں
آدمی کی قوت ایجاد سے معمور ہے
اس کے جوہر کی تجلّی سے فضا پرنور ہے
پھر طلب گاری نظری کو اس کے بام و در کی ہے
خاطر شعلہ یہ بھاری قید خاکستر کی ہے
زندگی پاتی ہے لذت غم تعمیر سے
دور ہوجاتی ظلمت وادی تقدیر سے ۶۳؎

انور اعظمی کا مکمل ادبی سرمایہ مقصدیت اور سبق آموز ہے اور ان کا قلم پوری زندگی جہاد کرتا رہا اور شرک و بدعات، ظلم و زیاتی اور غلط فکروں کے خلاف آواز بلند کرتا رہا اور وہ کوشش کرتے رہے۔ انور اعظمی گونا گوں صلاحیتوں کے مالک تھے، جن کا اندازہ ان کے علمی کارناموں سے کیا جاسکتا ہے۔ وہ ایک بلند پایہ شاعر، عظیم مقالہ نگار، بے مثل افسانہ نگار کے ساتھ ساتھ ایک بے باک صحافی بھی تھے۔ وہ بیک وقت کئی فن پر دسترس رکھتے تھے، عہد طالب علمی سے وفات تک ان کا قلم رواں دواں رہا، انھوں نے اپنی تمام صلاحیت و بصیرت کو معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں اور ظلم و زیادتی کے سدباب کے لیے وہ اپنے افکار و خیالات کو صفحۂ قرطاس پر بکھیرا، ان کا ادب مقصدیت سے پُر ہے۔

حواشی

۱- انقلاب رنگون، انور نمبر، ۲۴/اپریل ۱۹۶۱ء

۲- ایضاً

۳- ایضاً

۴- پرواز رنگون، ۲۹/مارچ ۱۹۶۱ء

۵- انقلاب، رنگون، انور نمبر، ۲۴/اپریل ۱۹۶۱ء

۶- ایضاً

۷- پرواز، رنگون، ۴/اپریل ۱۹۶۱ء

۸- انور اعظمی، اذان سحر، کوہ نور پریس لال کنواں، دہلی، ۱۹۶۷ء، ص ۱۲

۹- پرواز، رنگون، ۲۳/اپریل ۱۹۶۱ء

۱۰- انقلاب، رنگون، انور نمبر، ۲۴۔اپریل ۱۹۶۱ء

۱۱- ایضاً

۱۲- روزنامہ پرواز، رنگون، ۲۹/مارچ ۱۹۶۱ء

۱۳- پرواز، رنگون، ۴/اپریل ۱۹۶۱ء

۱۴- ایضاً

۱۵- ایضاً

۱۶- انقلاب، رنگون، انور نمبر، ۲۴/اپریل ۱۹۶۱ء

۱۷- ایضاً

۱۸- ایضاً

۱۹- ایضاً

۲۰- ایضاً

۲۱- ایضاً

۲۲- ایضاً

۲۳- ایضاً

۲۴- روزنامہ پرواز رنگو۴ر اپریل ۱۹٦۱ء

۲۵- پرواز، رنگون، ۲۳ر مارچ ۱۹٦۱ء

۲٦- ایضاً

۲۷- انقلاب رنگون، انور نمبر ۲۴ر اپریل ۱۹٦۱ء

۲۸- ایضاً

۲۹- ایضاً

۳۰- ایضاً

۳۱- ایضاً

۳۲- ایضاً

۳۳- پرواز، رنگون، ۳۱ مارچ ۱۹٦۱ء

۳۴- انقلاب، رنگون، انور نمبر، ۲۴ر اپریل ۱۹٦۱ء

۳۵- پرواز، رنگون، ۲۳ر اپریل ۱۹٦۱ء

۳٦- انقلاب رنگون، انور نمبر ۲۴ر اپریل ۱۹٦۱ء

۳۷- پرواز رنگون، ۴ر اپریل ۱۹٦۱

۳۸- پرواز رنگون، ۳۱ر مارچ ۱۹٦۱ء

۳۹- انقلاب رنگون، انور نمبر ۲۴ر اپریل ۱۹٦۱ء

۴۰- انور اعظمی، انور اعظمی، اذان سحر، کوہ نور پریس لال کنواں، دہلی، ۱۹٦۷ء، ص: ۳۱۷

۴۱- ایضاً،ص۳۱۳

۴۲- ایضاً،ص۳۱٦

۴۳- ایضاً،ص۳٦۲

۴۴- ایضاً،ص۹۹

۴۵- ایضاً،ص۱٦۳

۴٦- ایضاً،ص۱۷۹

۴۷- ایضاً،ص۹۹

۴۸- ایضاً،ص۳۱۷

۴۹- ایضاً،ص:۳۱۰

۵۰- ایضاً،ص:۳۱٦

۵۱- ایضاً،ص:۱۱۰

۵۲- ایضاً،ص:۳۱۷

۵۳- ایضاً،ص:۲۱۲

۵۴- ایضاً،ص:۱٦۹

۵۵- ایضاً،ص:۲۱٦

۵٦- ایضاً،ص:۲۰۵

۵۷- ایضاً،ص:۲۴۱،۲۴۲

۵۸- ایضاً،ص:۱۸۸

۵۹- ایضاً،ص:۲۱۳

٦۰- ایضاً،ص:۱۲٦

٦۱- ایضاً،ص:۲۵۴

٦۲- ایضاً،ص:۲٦۲

باب چہارم

انور اعظمی کی اردو شاعری کا ایک تجزیاتی وتنقیدی مطالعہ

فصل اول: انور اعظمی کی اردو شاعری کے مختلف اصناف

فصل دوم: انور اعظمی کی اردو شاعری کے مختلف موضوعات

فصل سوم: انور اعظمی کی اردو شاعری کا ایک تجزیاتی وتنقیدی مطالعہ

انور اعظمی کی اردو شاعری کے مختلف اصناف

کسی زبان کی شاعری کا مطالعہ محض شاعری کا مطالعہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اس مطالعے میں وہ تہذیبی اور ثقافتی پس منظر بھی جھلکتا ہے۔ جس میں اس زبان کی شاعری نے جنم لیا ہے۔ مگر یہ پس منظر کسی سادہ ورق کی طرح ایک ہموار سطح نہیں پیش کرتا بلکہ اس میں نظریات کی کشمکش اور شاعر کی ذہنی ساخت اور زاویہ مُطالعہ ومشاہدہ سے ایک خاص رنگ پیدا ہوتا ہے۔ جو داخلی یا تہذیبی تصادم کا پیدا کردہ ہوتا ہے۔ انور اعظمی کی شاعری کا ایک خاص ذائقہ بو باس اور رنگ ہے۔ ان کا اپنا ایک دائرہ ہے اور اس دائرے سے سرموانحراف بغاوت کے مترادف ہے اس لئے ان کے یہاں تہذیب سے وابستگی نمایاں نظر آتی ہے۔ انہوں نے قوم کی زبوں حالی کا ماتم نہ صرف یہ کہ مختلف پیرائے میں کیا ہے بلکہ اس کے لئے اردو زبان کی مختلف اصناف کا استعمال کیا ہے۔

''انور اعظمی کی اردو شاعری کے مختلف اصناف'':

انور اعظمی نے پیغام رسانی کے لئے اردو شاعری کی تقریباً ساری اصناف سخن کا استعمال کیا ہے۔

''غزل'':

غزل اردو شاعری کی سب سے مقبول صنف سخن ہے۔ اس کی صنفی پہچان اس کی مخصوص ہیئت پر ہے۔ اس صنف میں موضوع کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ زمانے تک حسن وعشق کی کیفیات اور جذبات کے اظہار کے لئے ایک مؤثر وسیلہ سمجھی جاتی تھی۔ لیکن یہ کبھی بھی کسی موضوع کے دائرے میں بندھ کر نہیں رہی بلکہ ہر طرح کے اظہار خیال کے لئے اس نے اپنی طاقت کا لوہا منوایا ہے۔ زمانۂ جدید میں غزل جس طرح کا موضوعاتی خیال پیش کر رہی ہے اس کے پیش نظر اس کی تخلیقی توانائی اور وسعت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ یہ صنف صرف اپنی ہیئت کی بنیاد پر ہی پہچانی جاسکتی ہے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ اس کی صنفی تشکیل میں کچھ چیزیں معاون ہوتی ہیں۔

ہیئت کے اعتبار سے غزل کے اجزائے ترکیبی درج ذیل ہیں:

مطلع - قافیہ - ردیف - مقطع

غزل کا پہلا شعر مطلع کہلاتا ہے جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔

حسن گل، نورسحر، رنگ بہاراں ہونا
ان کو دشوار ہوا جاتا ہے پنہاں ہونا ۱؎

اس شعر میں ''بہاراں'' ''پنہاں'' قافیے ہیں اس کی ردیف ''ہونا'' ہے۔

غزلوں میں ردیف کا استعمال چونکہ کثرت سے ہوتا ہے۔ اس لئے یہ غزل کی ہیئت کا ایک حصہ ضرور بن گئی لیکن اسے ہم غزل کی ہیئت کا بنیادی رکن یا عنصر قرار نہیں دے سکتے اس لئے کہ غیر معروف غزلوں کی مثالیں بھی کم نہیں ہے۔

اے نقاب روئے لیلیٰ احتیاط
زور پر ہے شورشِ مجنوں ہنوز ۲؎

مندرجہ بالا شعر مطلعے کی مثالیں ہیں ایسا بھی اکثر ہوا ہے کہ بعض شعراء نے بغیر مطلع کے بھی غزلیں کہی ہیں۔ بہرحال مطلعے کی خاص پہچان دونوں مصرعوں کا ہم قافیہ ہونا ہے۔ مطلعے کے بعد آنے والے سارے اشعار میں پہلا مصرع قافیے کا پابند نہیں رہتا لیکن تمام ثانی مصرع ہم قافیہ ہوتے ہیں مثال کے طور پر انور اعظمی کی یہ غزل پیش کی جاتی ہے۔

بھولنے والے یہ کیا عالم ہے تیری یاد کا
یک بیک لہجہ بدل کر رہ گیا فریاد کا
آشیاں کو بھی بنادیتی ہے بے ذوقی قفس
پھر زمانے میں ہے رسوا نام کیوں صیاد کا
غرق ہونے پر بھی دل یہ سوچ کر شرمندہ ہے
سر پر احساں رہ گیا طوفاں ابر وباد کا
حسرت پرواز کا سارا بھرم جاتا رہا
میں رہا ہونے پر بھی تکتا ہوں منہ صیاد کا
تم ذرا اپنی اداؤں کا تلاطم روکتے

دیکھتے ہم حوصلہ چرخ ستم ایجاد کا
شمع اپنے آنسوؤں کی آگ ہی میں جل بجھی
آسرا جھوٹا ہی نکلا حاصل فریاد کا [۳]

مندرجہ بالا اشعار میں پہلا شعر جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ و ہم ردیف ہیں مطلع ہے (یاد کا۔ فریاد کا) اشعار ۲،۳،۴،۵،۶ کے پہلے مصرعوں میں قافیہ ردیف نہیں ہے۔ دوسرے مصرعوں میں قافیہ ردیف موجود ہیں۔ (صیاد کا۔ باد کا، صیاد کا، ایجاد کا، فریاد کا) اس سے واضح ہوا کہ غزل کا قافیائی نظام اب، ج ب، د ب، ہ ب کے مصداق ہوتا ہے۔

غزل کی ہیئتی ترکیب کی آخری چیز ''مقطع'' ہے۔ چونکہ اکثر غزل گو شعراء اپنی غزلوں میں مقطع ڈالتے ہیں اس وجہ سے یہ غزل کی ہیئت کا ایک اہم جزء بن ضرور گیا ہے لیکن ہم اسے ہیئت کا بنیادی رکن نہیں کہہ سکتے کیونکہ موجودہ زمانے میں اس کی پیروی کم کی گئی ہے مقطع غزل کا آخری شعر ہوتا ہے اور اس کی پہچان یہ ہے کہ شاعر اس میں اپنا مختصر سا نام جسے اصطلاحاً تخلص کہا جاتا ہے استعمال کرتا ہے۔

غربت میں بھی سامان تجلی کے ہیں انورؔ
پر جلوۂ یارانِ وطن اور ہی کچھ ہے [۴]

اس شعر میں ''انور'' شاعر کا تخلص ہے جس کی وجہ سے اصطلاحاً یہ شعر مقطع ہے۔

غزل میں مطلع اور مقطعے کے وجود کا ایک نفسیاتی جواز ضرور ہے۔ بلکہ مطلع کے معنی ہیں ''طلوع ہونے کی جگہ'' لہٰذا مطلع وہ شعر ہوا جس سے غزل کا آغاز ہوتا ہے۔ اسی سے یہ تعین ہو جاتا ہے کہ اس غزل کی بحر کیا ہوگی، اس کے ردیف قافیے کیا ہوں گے۔ مقطع کے معنیٰ ہیں ''قطع ہونے کی جگہ'' آخری شعر میں شاعر کے تخلص سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اب اس نے اپنی بات ختم کر دی ہے جس مخصوص ذہنی رو اور موڈ کے تحت سارے اشعار وجود میں آئے اس کا سلسلہ اب ختم ہوا ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو مطلع دراصل غزل کا نقطۂ آغاز ہے اور مقطع نقطۂ اختتام۔

غزل کی صنفی پہچان میں مندرجہ بالا ہیئتی ارکان و عناصر کے علاوہ جو چیزیں نہایت اہم اور بنیادی ہے وہ یہ ہے کہ غزل کا ہر شعر اپنی جگہ ہے اور اپنے آپ میں ایک مکمل وحدت اور بہ لحاظ خیال و موضوع مکمل ہوتا ہے یعنی غزل کے مختلف اشعار متحد المعنی اور تسلسل خیال کے حامل نہیں ہوتے۔ ان

میں سے کوئی شعر شاعر کی کسی داخلی واردات یا کیفیت کا عکاس ہوسکتا ہے تو کوئی حسن یا حسنِ محبوب کی تصویر اتار سکتا ہے۔ کوئی شعر دنیا کی بے ثباتی کو پیش کر سکتا ہے تو کوئی فلسفہ و اخلاق کے کسی نقطے کا مظہر ہو سکتا ہے۔ کسی شعر میں سیاسی صورت حال کا نقشہ پیش کیا جاسکتا ہے تو کسی میں زمانے کی زبوں حالی اور ستم شعاریوں کو بے نقاب کیا جاسکتا ہے۔ کوئی شعر مناظر فطرت کا مرقع بن سکتا ہے تو کوئی انسانوں کی سیرت و شخصیت اور کردار کے کسی پہلو کو نمایاں کر سکتا ہے گویا پوری غزل معنیٰ، خیال اور موضوع کے لحاظ سے بے مثل تنوع کی حامل ہوسکتی ہے۔ مثال کے طور پر انور اعظمی کی یہ غزل پیش کی جاسکتی ہے۔

ترے غم میں نہیں لٹنے کی بھی رخصت مجھ کو
تجھ سے بڑھ کر ہے زمانے سے شکایت مجھ کو
پھول سے سینۂ تربت کو سجانے والو
زندگی میں بھی تھی پھولوں کی ضرورت مجھ کو
خاطر بزم ہے منظور جو پی لیتا ہوں
ورنہ ساقی سے ہے یک گونہ شکایت مجھ کو
نگہ شوق تو گھبرا کے وہیں بیٹھ گئی
لے اڑی جلوہ گہ ناز سے حیرت مجھ کو
زخم گل، داغ ِ قمر، خونِ شفق، چاک سحر
اپنے پردے پہ دکھادی مری صورت مجھ کو
کاش دشمن ہی رہیں ہیں جو وہ دشمن انورؔ
دوست کے نام سے اب ہوتی ہے وحشت مجھ کو۵

یہ منتشر الخیالی غزل کی ایک بہت بڑی قوت ہے اور اس کی صنفی پہچان کا ایک اہم وسیلہ ہے۔ خیال، موضوع اور معنیٰ کے اس تنوع کے باوجود غزل کا ایک مخصوص مزاج ہوتا ہے اس نقطے کے سلسلے میں ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

''غزل کا ہر شعر ایسا جزو ہے جو غزل کا حصہ ہونے کے باوجود اس سے جدا بھی ہے۔ یہ شعر ایک

الگ حیثیت کا حامل ہے لیکن اس کے باوصف غزل کے دھاگے سے منسلک بھی ہے۔'' ۶ے

غزل کا یہ ''دھاگا'' کیا چیز ہے؟ جو منتشر الخیال اشعار کو مربوط اور ایک ہی رشتے میں منسلک رکھتا ہے اور کسی تخلیق کو غزل کے درجہ پر پہنچاتا ہے اسے بھی جاننا ضروری ہے۔ جیسا کہ عرض کیا کہ غزل کا ایک مخصوص مزاج ہوتا ہے جو معنی و مفہوم کے فرق و اختلاف کے باوجود تمام اشعار میں اندرونی یا زیریں سطح پر موجود ہوتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح پھولوں کے ایک ہار میں کوئی پھول گلاب کا ہوتا ہے کوئی موگرے کا، کوئی چنبیلی کا کوئی گیندے کا، اور وہ سب ایک دھاگے سے ایک دوسرے میں گھتے ہوئے ہوتے ہیں۔ اوپری سطح پر پھول اپنا جدا رنگ اور جدا شان رکھتا ہے۔ اور سب کے حسن سے مل کر ہار خوبصورت اور دیدہ زیب بنتا ہے۔ لیکن وہ شے جس نے ان سب مختلف رنگوں اور خوشبوؤں کو ایک دوسرے سے مربوط کر رکھا ہے نظروں سے اوجھل ہے۔ نظر سے اوجھل ہونے کے باوجود اس کی بڑی طاقت اور اہمیت ہے۔ اس لئے اگر یہ ''دھاگا'' ٹوٹ جائے تو سارے پھول بکھر جائیں اور ہار کا وجود ہی ملیا میٹ ہو جائے۔

غزل میں یہ اندرونی یا زیریں دھاگا غزل گو شاعر کا اپنا داخلی احساس و جذبہ ہے جو خارج کے ہر مظہر کو اس کا اپنا تجربہ بنا دیتا ہے۔ لہٰذا یہ غزل کا مخصوص مزاج داخلیت سے عبارت ہے۔ چنانچہ غزل کو اس کے وصف کے موضوع میں قید نہیں کیا جا سکتا اور حسن و عشق، دنیا کی بے ثباتی، سماجی مسائل، غرض کہ ہر قسم کے خیالات مختلف اشعار میں بیان کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن ان سب کو ایک دوسرے سے مربوط و منسلک رکھنے کے لئے ایک مخصوص داخلی رنگ کی اور ایک مخصوص جذبہ و احساس کی ضرورت ناگزیر ہے۔ اور یہ تب ہی ممکن ہے جب کہ غزل گو شاعر زندگی کے تمام خارجی مظاہر کو اپنی ذات اور فکر کا جز بنا لے۔ انہیں واقعے کی طرح خود کو ان سے علیٰحدہ کر کے بیان نہ کرے بلکہ انہیں اپنی ہی ذات کی ایک واردات بنا کر پیش کرے۔ شاعر کی ذات و شخصیت کی ہر بیان و اظہار میں یہ شرکت جسے ہم غزل کی مخصوص کیفیت کا نام دے سکتے ہیں پوری غزل اور اس کے ہر شعر کے بطن میں جاری و ساری ہونی چاہئے۔ مثال کے طور پر انور اعظمی کی یہ غزل پیش کی جاتی ہے:

وہ ایک لمحہ تصور کا بہت نایاب ہوتا ہے

جب آنکھیں تشنہ لب ہوتی ہیں دل سیراب ہوتا ہے
گل ولالہ کی جھرمٹ میں بہار آئی تو کیا آئی
کہ اب تک اشک شبنم سے چمن شاداب ہوتا ہے
وہ منظر جس پہ ہستی کی حقیقت آ کے کھلتی ہے
کسی دیوانۂ زلف رسا کا خواب ہوتا ہے
وہ ہیں کم ظرف جو طوفان کو الزام دیتے ہیں
سفینہ پستیٔ ہمت سے غرق آب ہوتا ہے
یہ حالت بھی تو اہل دہر سے دیکھی نہیں جاتی
کوئی زخمی اگر زخموں سے لذت یاب ہوتا ہے
میری دنیائے غم یا رب کہیں ویراں نہ ہوجائے
نہ آنکھیں خون روتی ہیں نہ دل بے تاب ہوتا ہے
ہو آواز شکست دل کہ غنچے کی چٹک انورؔ
وہی بیتاب کرتا ہے جو خود بے تاب ہوتا ہے [۷]

چونکہ غزل کے ایک شعر کے دو ہی مصرعوں میں ایک مکمل اور بڑے سے بڑا خیال پیش کر دیا جاتا ہے اس لئے اس کی ایک اہم خصوصیت ایجاز واختصار ہے۔ یعنی کم سے کم الفاظ میں بڑی سے بڑی بات کہہ دی جائے۔ اس کے لئے شاعر کا قادرالکلام ہونا ضروری ہے۔ غزل میں ایجاز واختصار ایک ایسا وصف ہے جسے لانے کے لئے شاعر علامتوں، کنایوں، استعاروں، تشبیہوں اور صنائع وبدائع جیسے سہاروں سے کام لیتا ہے۔ غزل میں ایجاز واختصار سے بھی زیادہ اہم صفت یہ ہے کہ شعر کے دونوں مصرعے آپس میں پوری طرح گتھے ہوئے ہوں اور ایک لفظ دوسرے لفظ کی طرف اشارہ کرتا ہو۔

جہاں تک انور اعظمی کی غزلوں کا تعلق ہے تو ان کی کہی ہوئی دوسری اصناف سخن کے مقابلے میں زیادہ ہیں۔ ان غزلوں کی بحریں نہ تو بڑی ہیں اور نہ ہی چھوٹی ہیں بلکہ عموماً وہ بیچ کی بحروں کا انتخاب کرتے ہیں۔ غزل کے مجموعے میں ان کی طویل ترین بحر میں ذیل کے اشعار یا غزل کہی گئی ہے۔

ناموس نگاہ ساقی کے محفل میں نگہباں ہوتے ہیں
وہ شعلہ بجاں جو توڑ کے اپنے جام کو نازاں ہوتے ہیں
اس محفل ہستی میں اکثر یوں عیش کے ساماں ہوتے ہیں
داغوں سے چراغاں ہوتے ہیں، زخموں سے گلستاں ہوتے ہیں
اس کا تو یقیں ہے گلشن میں پرواز پہ کوئی قید نہیں
طائر کو ابھی تک یاد مگر صیاد کے احساں ہوتے ہیں
تزئین گلستاں ہوتی ہے پھولوں کے پریشاں ہونے سے
وہ رونق عالم ہوتے ہیں جو چاک گریباں ہوتے ہیں
احساس پہ حاوی تعزیریں، جذبوں پہ مسلط زنجیریں
زنداں سے چھٹے ہیں دیوانے یا داخل زنداں ہوتے ہیں
ہم خستہ جگر آجاتے ہیں یہ سوچ کے ان کی محفل میں
کچھ داغ تو روشن ہوتے ہیں کچھ زخم تو خنداں ہوتے ہیں
پھولوں سے اشارے ہوتے ہیں تاروں سے نمائش جاری ہے
وہ چھپنے کی کوشش کرتے ہیں تو اور نمایاں ہوتے ہیں
آنکھوں میں کھٹکتے ہیں تو انہیں گلزار بدر کرسکتے ہو
کانٹے ہی گلستاں میں لیکن پھولوں کے نگہباں ہوتے ہیں
موجوں کی جبیں کو خم کرنا دشوار نہیں انور لیکن
ہیں اہل سفینہ ایسے بھی جو شامل طوفاں ہوتے ہیں ۸؎

چھوٹی بحروں میں جن غزلوں کی مثال دی جاسکتی ہے وہ حرف تہجی ''زا'' پر ختم ہوتی ہیں۔

ہے شب غم نہ صبح جلوہ طراز
اے غم یار تیری عمر دراز
میری فریاد میری خاموشی

ایک افسانۂ لب بے ساز
تم نہیں ہو اگر میرے نزدیک
کون دیتا ہے ہر گھڑی آواز
آشیاں اس لئے جلاتا ہوں
ہے بڑی چیز لذت پرواز
گردش جام وگردش دوراں
ایک تیری نگاہ کا اعجاز
اس کرم سے بھلی تھی محرومی
مے ہوئی جارہی ہے سینہ گداز
تو نے ٹھکرادیا غنیمت ہے
تھی کہاں پرسش جبیں نیاز
چاک دامن تو کچھ نہیں لیکن
ڈر ہے رسوا نہ ہو وہ زلف دراز
درد پنہاں کی خیر ہو انورؔ
آج دل کا مزاج ہے ناساز [9]

انور اعظمی کی غزلوں میں موجودہ غم صرف محبوب کا غم نہیں ہے ان کا غم انسانیت کا غم ہے۔ وہ خود میں ڈوبے رہنے کے قائل نہیں ہیں بلکہ وہ دوسروں کا غم بھی کھاتے ہیں۔ انہیں صرف محبوب کی ملاقات مطلوب نہیں بلکہ وہ اس کی جدائی میں ہونے والے دوسرے غموں کی تلافی بھی چاہتے ہیں۔

اب ملوگے بھی تو کیا خاک تلافی ہوگی
غم سہے اور بھی ہم نے غم ہجراں کے سوا [10]

موجودہ حکمرانوں پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

رقص بے ربط ہوجاتا ہے پیمانے کا
نظم ساقی سے سنبھلتا نہیں مے خانے کا [11]

اس کائنات میں انسان کو قدرت نے وہ سلیقہ عطا کیا ہے کہ وہ خزاں میں بھی بہار کا سماں پیدا کر سکتا ہے اسی بات کو انور اعظمی اپنے انداز میں کہتے ہیں:

آشیاں کو بھی بنادیتی ہے بے ذوقی قفس
پھر زمانے میں ہے رسوا نام کیوں صیاد کا ۱۲

انور اعظمی اپنے محبوب کو گلیوں کوچوں میں نہیں ڈھونڈتے حتی کہ وہ ان سے ملنے کی خواہش بھی نہیں کرتے۔ان کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ ان کی یاد میں محو رہیں اور اسی بات کو وہ حاصل زندگی سمجھتے ہیں۔

زندگی کو محو یاد یار ہوجانے دیا
ان کے ہر اقرار کو انکار ہو جانے دیا ۱۳

....

یاد محبوب میں کھو جانے کی فرصت بھی نہ دی
اب سوا اس سے زمانے کا ستم کیا ہوگا ۱۴

محبوب کی دی ہوئی ہر چیز انور اعظمی کو بے حد عزیز ہے۔اس سے منسوب ہر چیز کو وہ صرف یہی نہیں کہ حرز جاں بناتے ہیں بلکہ اس کی بدنامی کے ڈر سے اسے نہ نام کرتے ہیں اور نہ اس کا بدل چاہتے ہیں:

ہم تلاش مرہم زخم جگر کیوں کریں
کوشش رسوائی تیر نظر کیوں کریں ۱۵

....

ہے سیہ بختی بھی یاد افزائے زلف عنبریں
ہم شب غم میں تمنائے سحر کیوں کر کریں ۱۶

انور اعظمی کی شاعری غم عشق کی شاعری ہی نہیں بلکہ اس میں کائنات کا غم بھی پوشیدہ ہے جو لہجہ بدل بدل کر سامنے آتا ہے۔

''رباعی''

اردو کی شعری اصناف میں رباعی ایک چھوٹی سی لیکن ایک اہم صنف ہے ۔ یہ عام طور پر

فلسفیانہ، اخلاقی ،تفکیری اور کبھی کبھی عشقیہ مضامین پر مبنی ہوتی ہے۔لیکن اس کا عام رنگ وہ ہوتا ہے جسے انگریزی میں lyrical کہتے ہیں۔یعنی یہ خطابیہ اوراصلاحی انداز سے عموماً گریز کرتی ہے۔

رباعی کی تعمیر وتشکیل میں سب سے آسان چیز اس کی ہیئت ہے اس کی صوری ہیئت میں کوئی منفرد نئی اورانوکھی بات نہیں ہے۔چار مصرعوں پر مشتمل یہ صنف غزل کے دوشعروں سے مشابہ ہے البتہ ان کی اندرونی ہیئت جس کا تعلق خاص عروض سے ہے اس کی صنفی شناخت کا خاص وسیلہ ہے۔

رباعی کی بحر عام طور پر مشکل سمجھی جاتی ہے اس لئے کثیر تعداد میں رباعیاں نہیں کہی گئی ہیں۔لیکن اس کے باوجود یہ صنف ہر عہد میں مقبول اور محترم رہی ہے۔چنانچہ ہر بڑے شاعر نے تھوڑی بہت رباعیاں ضرور کہی ہیں۔

رباعی عربی زباں کا کا لفظ ہے۔جس کے معنی ہیں ’’چار چار‘‘ اصطلاحاً اس سے وہ شعری ہیئت مراد ہے جو چار مصرعوں پر مبنی ہو اور فکر وخیال کے لحاظ سے مکمل ہو۔رباعی کے چار مصرعوں میں خیال مربوط و مسلسل ہوتا ہے اور آخری مصرعے میں خیال کی تکمیل ہوتی ہے،اس کے پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور تیسرا مصرعہ بے قافیہ۔

دل فکر کم وبیش کا زندانی ہے
مغرب پہ ہوس کاری کی سلطانی ہے
پہنچایا اسے ذوق تجارت نے وہاں
کہ اشک بھی قیمت میں جہاں پانی ہے ۱۷

رباعی کے قافیے مردف بھی ہوسکتے ہیں اور غیر مردف بھی،مندرجہ بالا رباعی میں ’’زندانی‘‘، ’’سلطانی‘‘، ’’جہاں پانی‘‘ قافیے ہیں اور ’’ہے‘‘ ردیف ہے۔رباعی کے پہلے اور دوسرے اور چوتھے مصرعے چونکہ ہم قافیے ہوتے ہیں اس لئے اصطلاحاً وہ ’’محض مصرعے‘‘ یا ’’ مقفی مصرعے‘‘ کہلاتے ہیں۔جب کہ تیسرا مصرعہ قافیہ نہ ہونے کے سبب ’’خصی‘‘ کہلاتا ہے۔ایسی رباعی جس کے چاروں مصرعے مقفی ہوتے ہیں غیر خصی کہلاتی ہے۔

قطعہ: موضوعاتی سطح پر ہم قطع کو صنف سخن نہیں کہہ سکتے ہیں۔اس کی ہیئت بھی کوئی بہت زیادہ

منفرد نوعیت نہیں رکھتی اس کی ہیئت غزل کی ہیئت کی طرح ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ غزل کہ ہیئت کے مانند اس میں مطلع نہیں ہوتا۔ تمام اشعار غزل کی طرح ہوتے ہیں، اس میں قافیائی نظام کا تعین پہلے شعر کے مصرعے ثانی سے ہوتا ہے۔ یعنی آگے آنے والے سارے اشعار کے ثانی مصرعے پہلے شعر کے مصرعے ثانی کے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ اس طرح الف ب، ج ب، د ب، ہ ب، مثال کے طور پر انور اعظمی کا یہ قطعہ ملاحظہ فرمائیں:

چھپا چھپا کے نہ رکھ ان جگر کے داغوں کو
انہیں ستاروں سے ایک آفتاب پیدا کر
نہ ہو سکے تو شکایت نہ کر زمانے کی
جو ہو سکے تو کوئی انقلاب پیدا کر [۱۸]

اشعار کی اس یکساں تنظیم کے باوجود قطعہ غزل سے مختلف چیز ہے کیونکہ غزل کے تمام شعر مفہوم اور مضمون کے اعتبار سے منتشر اور اپنے آپ میں مکمل ہوتے ہیں۔ لیکن قطعہ کے تمام اشعار معنوی لحاظ سے مسلسل اور ایک دوسرے سے پیوست ہوتے ہیں۔ تمام اشعار کا متحد المعنیٰ ہونا اور تمام مصرعوں میں خیال کا تسلسل قطعہ کو دراصل ایک نظم بنا دیتا ہے۔ اور یوں یہ چیز صنف نہیں بن پاتی۔ غزل سے معمولی فرق کے ساتھ محض ایک ہیئت رہ جاتی ہے۔ ایسی ہیئت جو مطلع نہ ہونے کے سوا اور کوئی انفرادی شناخت نہیں رکھتی۔ لیکن وہ قطعہ جن میں شاعروں نے مطلعے کا بھی اہتمام کر ڈالا ہے انہیں ہیئتاً غزل سے کسی طرح بھی الگ تصور نہیں کیا جا سکتا۔ انہیں غزل کی ہیئت میں کہی گئی نظم ہی کہنا چاہیئے۔

قطعہ کی عموماً تین صورتیں نظر آتی ہیں۔ اول یہ کہ اس میں زیادہ سے زیادہ اشعار کی چونکہ کوئی قید نہیں اس لئے ایسا قطعہ جو دو مصرعوں سے زائد ہے اور اس کے تمام مصرعے اور اشعار ایک دوسرے سے مربوط ہیں وہ نظم ہے۔ ایسا قطعہ الگ سے لکھا جاتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ایک قطعے میں کم از کم دو شعر ہونے لازمی ہیں چنانچہ وہ دو شعر جو رباعی کے کسی مخصوص وزن میں نہیں ہیں وہ اصطلاحاً قطعہ کہلاتے ہیں رباعی نہیں۔ دونوں شعر مل کر خیال کی تکمیل کرتے ہیں اور یہ بھی الگ لکھے جاتے ہیں جیسا کہ درج بالا انور اعظمی کا قطعہ پیش کیا گیا ہے۔ تیسری شکل خاص غزل کے صنف کے اندر پائی جاتی ہے

اس لئے کبھی کبھی غزل گوشاعر کے سامنے یہ دقت آ جاتی ہے کہ کوئی خیال دو مصرعوں میں نہیں سماپا تا تو وہ اس کی تکمیل ایک سے زائداشعار میں کر دیتا ہے۔ چنانچہ غزل کے اندر ایسے اشعار جن میں ایک خیال ایک شعر سے دوسرے یا تیسرے یا اس سے زائد اشعار میں منتقل ہوا ہے وہ اصطلاحا قطعہ بند اشعار کہلاتے ہیں۔ ایسا قطعہ علیحدہ وجود نہیں رکھتا غزل کا حصہ ہوتا ہے۔مثال کے طور پر انور اعظمی کے دو اشعار کا قطعہ ملاحظہ فرمائیں:

ملت اسلام کے شریان کو
ہے ضرورت گرم وتازہ خون کی
اور یہ فکر وادب کی محفلیں
بانٹتی ہیں گولیاں افیون کی ۱۹

''فریب''اور''شرک'' کے عنوان سے کہے گئے اشعار کوانور اعظمی نے قطعہ کی شکل دی ہے۔ اذان سحر کے آخر مین انور اعظمی کے قطعات کو یکجا کیا گیا ہے۔مگر''فریب''اور''شرک'' کے قطعات طویل ہیں۔

''نظم'':۔

ہماری کلاسیکی تنقید میں''نظم'' سے جملہ شاعری مراد لی گئی ہے لہٰذا بلاغت کی دستیاب کتابوں میں یہ لفظ انہیں معنوں میں استعمال ہوا ہے لیکن یہاں ہماری مراد نظم سے وہ مخصوص صنف سخن ہے جسے بالعموم ہم غزل کے مقابلے پر رکھتے ہیں۔

غزل کی ہیئت مخصوص ہوتی ہے نظم کے لئے کسی خاص ہیئت کی تخصیص نہیں،غزل کے اشعار میں باہمی تسلسل نہیں ہوتا لیکن نظم کے اشعار موضوع اور خیال کے اعتبار سے ایک دوسرے سے پیوست ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ وہ صنف سخن ہے جو غزل کے مقابل ہر زمانے میں موجود رہی ہے اور جس کی مثالیں قلی قطب شاہ سے لے کر عہد جدید تک بکثرت ملتی ہیں۔

معنوی اعتبار سے ''نظم ایک نہایت بسیط ووسیع اور ہمہ گیر اصطلاح ہے۔ یہاں تک کہ اگر اصناف سخن میں سے غزل کو الگ کر دیا جائے تو دیگر تمام اصناف سخن مثلاً قصیدہ،مثنوی،مرثیہ،واسوخت اور شہر آشوب درحقیقت نظم ہی کے مختلف موضوعات واسالیب قرار پائیں گے۔یعنی ہر وہ شعری تخلیق جو

خیال کی ریزہ کاری پر نہیں خیال وفکر کی شیرازہ بندی، تسلسل اور ربط پر مبنی ہے۔ وہ وسیع تر معنوں میں نظم ہے لیکن نظم سے یہاں ہماری مراد نہ قصیدہ، نہ مرثیہ، نہ مثنوی، نہ شہر آشوب، نہ واسوخت۔ بلکہ وہ صنف ہے جسے ہم محض ''نظم'' ہی کہتے ہیں۔

نظم کا بحیثیت صنف سخن زیادہ صحیح تصور جدید تناظر میں واضح ہوگا۔غزل کے ماسوا دیگر اصناف سخن مثلاً قصیدہ، مثنوی، مرثیہ وغیرہ کا جدید شاعری میں وہ رواج باقی نہیں رہا جو کلاسیکی شاعری میں تھا ۔اور جہاں یہ چاروں اصناف اردو شاعری کی اہم اور بڑی اصناف سمجھی جاتی تھیں عہد جدید میں نظم کے ارتقاء اور اس کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے اسے اردو شاعری کی پانچویں اہم اور بڑی صنف قرار دیا جاسکتا ہے۔ بلکہ موجودہ عہد میں تو اگر غزل کے دوش بدوش کوئی صنف سخن زندہ ہے اور پوری طاقت وتوانائی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے تو وہ نظم ہی ہے۔اس لحاظ سے جدید شاعری کی سب سے بڑی دو ہی اصناف غزل اور نظم ہیں۔

نظم ایک مخصوص اور معروف صنف سخن کی حیثیت سے نظیر اکبر آبادی کی شاعری میں نظر آتی ہے اور حالی کے زمانے سے اس کی روایت کا استحکام ہوتا ہے ۔شاعر کی حیثیت سے نظیر اکبر آبادی ،حالؔی، اقبالؔ، چکبستؔ، جوشؔ، فیضؔ، ن م راشدؔ، میرا جیؔ، اختر الایمانؔ، سردار جعفریؔ، مخدومؔ وغیرہ کی شناخت اسی صنف سے وابستہ ہے۔

نظم موضوعات اور ہیئتوں کے لحاظ سے اس قدر متنوع اور ہمہ گیر صنف ہے کہ اس کو کسی ایک یا چند موضوعات اور ہیئتوں کو مختص نہیں کیا جا سکتا۔ زندگی کے ہر واقعہ، ہر واردات، ہر مظہر، ہر رنگ، ہر جذبہ، ہر احساس، ہر کیفیت کو نظم کا موضوع بنایا جاسکتا ہے۔لہٰذا یہ صنف موضوعا موضوعی اصناف کی صنف میں بھی نہیں بٹھائی جاسکتی۔اور نہ اسے موضوعی ہیئتی اصناف کے خانے میں رکھا جاسکتا ہے۔اور نہ ہیئتی اصناف میں اسے شمار کیا جاسکتا ہے۔مثال کے طور پر انور اعظمی کی نظم ''طلب'' یہاں پیش کی جاتی ہے:

یہ پچھلا پہر اور یہ دریا کا کنارہ ۔۔۔ خاموش ہوائیں ہیں تو مدہوش نظارا
لے آئی کرن چاند کی ایک شانۂ سیمیں ۔۔۔ اور موج کے بکھرے ہوئے گیسو کو سنوارا
کھو جانے پہ مائل ہے المناک فضا میں ۔۔۔ مغرب کے افق پر وہ بھٹکتا ہوا تارا
خاموشی ساحل سے الجھتی ہوئی موجیں ۔۔۔ بے چارگیٔ موج پہ ہنستا ہوا دھارا

اک شوق نے بکھرے ہوئے قطروں کو سمیٹا
اک درد نے ٹھہری ہوئی موجوں کو ابھارا

موجوں میں ہے روپوش سکندر کی حیات
قطروں میں ہے بکھرا ہوا افسانۂ دارا

بیتاب ،جنوں کوش ،شناسائے طلاطم
رک جانے کی مہلت ہے نہ تسلیم کا یارا

اک سوز طلب ،زخم جنوں ،درد تمنا
رستا ہوا ناسور تڑپتا ہوا پارا

ہر پیچ میں اک جذبۂ بیتاب ہے رقصاں
ہر موڑ پہ ہستی کے تمنا کا شرارا

گہوارۂ ساحل نے دیا دعوت آرام
تسکین کے لئے سبزۂ خود رونے پکارا

ہر اک غم بیتاب کی دنیا کو سمیٹے
ہنستا ہوا لہروں پہ تمنا کی سدھارا

اک شوق نہاں جس سے کہ محروم ہے دنیا
اک درد ، طلب خیر جو میرا نہ تمہارا

یہ درد کی دنیا یہ غمِ شوق کا عالم
جی میں ہے اسے لوٹ لوں میں سارے کا سارا[۲۰]

اس کے علاوہ نذر، قید تنہائی، مسلم، انتظار، عید کا چاند، خود شناسی، ہلال عید، بلبل، پھول، نیا دور، غیرت اور دین، جینے کا حق، ایک سوال، بے مائیگی، رواداری، فریبِ رنگ، قوم، جمہور، طاقت مسلم، لال قلعہ، تاج محل وغیرہ جیسی بہت سی نظمیں ان کے مجموعۂ کلام اذان سحر میں موجود ہیں۔

''مسمط'':۔

''مسمط'' ایک عربی لفظ ہے جو لفظ ''تسمیط'' کا مفعول ہے۔ تسمیط کے لغوی معنیٰ ہیں ''موتی پرونا'' یا بالفاظ دیگر ''منتشر اور بکھرے ہوئے اجزاء کو بترتیب ایک جگہ جمع کر دینا''۔ اصطلاح شعر کے طور پر اس کا مفہوم ایک ایسی نظم سے ہے جو بلحاظ ہیئت مختلف بندوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ بندوں میں مصرعوں کی تعداد مختلف ہو سکتی ہے۔ لیکن پہلے ہی بند سے مصرعوں کی تعداد مکرر کر دی گئی ہے۔ وہ بعد کے تمام بندوں میں برقرار رکھی جاتی ہے۔ بند میں مصرعوں کی تعداد کے لحاظ سے مسمط کی آٹھ قسمیں ہوتی ہیں۔ مثلث (تین مصرعوں کا بند)، مربع (چار مصرعوں کا بند)، مخمس (پانچ مصرعوں کا بند)، مسدس (چھ مصرعوں کا بند)، مسبع (سات مصرعوں کا بند)، مثمن (آٹھ مصرعوں کا بند)، متسع (نو مصرعوں کا بند) معشر (دس مصرعوں کا بند)۔

مصرعوں کی تعداد کے لحاظ سے چونکہ ہر بند کے لئے ایک علیٰحدہ اصطلاح رائج ہے۔اس لئے وہ مخصوص بند یا اس بند کی مخصوص ہیئت عام گفتگو میں اس مخصوص نام ہی سے منسوب کی جاتی ہے۔مثلاً کسی نظم کی ترکیب میں ہر بند پانچ پانچ مصرعوں پر مشتمل ہے تو کہا جائے گا یہ نظم ''مخمس'' ہے۔یا ''مخمس کی ہیئت'' میں ہے اسے کوئی مسمط نہیں کہتا تو پھر مسمط ہے کیا؟

مسمط دراصل متذکرہ بالا ان آٹھ شکلوں کے لئے ایک مجموعی نام ہے جس سے مراد یہ ہے کہ منتشر اور بکھرے ہوئے خیالات کو سلسلہ وار اور ایک خاص ترتیب سے یکجا کر دیا گیا ہے۔اس طرح جیسے موتیوں کو ایک لڑی میں پرو دیا گیا ہو۔گویا مسمط ایک مخصوص وضع یا ایک مخصوص ہیئتی نظام کا نام ہے خواہ اس ہیئت کی ترکیب تین تین مصرعوں سے ہوئی ہو، خواہ چھ چھ مصرعوں سے، مصرعوں کی تعداد کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ان سب کی وضع یا ان کی ترتیب کا انحصار جس اصول پر مبنی ہے اس اصول کا اصطلاحی نام مسمط ہے۔اور یہ مخصوص ہیئت بند میں مصرعوں کی تعداد کے لحاظ سے الگ الگ ناموں سے جانی جاتی ہے۔

''مسدس'':-

مسمط کی تمام ہیئتوں میں مسدس کی ہیئت سب سے زیادہ مستقل و مروج اور مقبول رہی ہے۔کربلائی اور شخصی مرثیے بیشتر اسی ہیئت میں لکھے گئے ہیں۔دیگر چھوٹی بڑی نظموں کے لئے یہ ہیئت بہت کثرت سے برتی گئی ہے۔لیکن مسمط کی اصل وضع سے کچھ فرق کے ساتھ یعنی ایسی صورت میں جس کے تحت ہر بند کے اولین چار مصرعے کسی ایک قافیے میں ہم قافیہ ہوتے ہیں اور آخری دو مصرعے اپنا الگ قافیہ رکھتے ہیں یعنی اس طرح الف الف الف الف ب ب/ ج ج ج ج د د/ ہ ہ ہ ہ و و۔

مسدس کی یہ وضع اقسام شعر کی کلاسیکی کتب میں مسمط کے ہیئتی نظام سے خارج تصور کی گئی ہے اس لئے کہ یہ مسمط کی اصل ہیئت کے نظام قافیہ کی خلاف ورزی کرتی ہے۔یعنی اس میں ہر بند کا چھٹا مصرعہ پہلے بند کے قافیوں کا ہم قافیہ نہیں ہوتا۔مسمط کی مختلف شکلیں اردو میں چونکہ عربی فارسی سے آئی ہیں اور وہاں مسدس کی یہ شکل موجود نہیں ہے اس لئے ہمارے علمائے ادب نے اسے مسمط کے دائرے سے خارج کر دیا۔اور یہ حقیقت ہے کہ مسدس کی ہیئتی وضع خاص اردو کی چیز ہے جسے بہت کثرت سے شاعروں نے برت کر مقبول بنایا۔

مسدس کی اس شکل میں ہر بند کے آخر میں دو مصرعے چونکہ ہم قافیہ ہو کر ایک بیت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور ترکیب بند کی مانند ٹیپ کے شعر (یا مصرعوں) کا کام دیتے ہیں۔اس لئے بعض علمائے سخن نے اسے ''ترکیب بند مسدس'' کے نام سے منسوب کیا ہے۔اگرچہ اس کے اولین چار مصرعے ترکیب بند کی طرح غزلیہ ہیئت پر مبنی نہیں ہوتے صرف آخری دو مصرعے ترکیب بند کی بیت کے مانند ہوتے ہیں۔اس لئے اسے ترکیب بند تو نہیں کہا جا سکتا ہاں آسانی کی خاطر اور اسکی شناخت کے لئے اسے ہم ''ترکیب بند نما مسدس'' یا ''ترکیب بند مسدس'' کہہ لیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔مثال کے طور پر انور اعظمی کی نظم ''شہزادۂ اسلام کی خدمت میں'' سے یہ بند پیش کیا جا سکتا ہے۔

جلوہ اگر ہے راز تو پردہ فریب ہے — سارا نظام رقص تمنا فریب ہے
ہر حسن اعتبار کی دنیا فریب ہے — اے دردمند !دست مسیحا فریب ہے
اس دور میں کسی کا بھی پرسان نہیں کوئی
یہ واقعہ ہے درد کا درماں نہیں کوئی ۲۱

انور اعظمی نے اور بھی کئی نظمیں مسدس کی صنف میں کہی ہیں مثلاً ''حدیث فردا''، ''حرم تلاش میں ہے''، سلام اے خطہ رنگ''، ''اے ہمالہ''، افسانۂ غماز''، ''آخری مرحلہ'' جیسی نظمیں انور اعظمی نے مسدس کے رنگ میں کہی ہیں۔اپنی مسدس میں انور اعظمی نے کہیں صرف قافیہ کا اور کہیں قافیہ ردیف دونوں کا اہتمام کیا ہے۔

متذکرہ بالا ساری نظموں میں انور اعظمی کا اسلامی فکر نمایاں ترین جز ہے۔وہ ''ادب برائے ادب'' کے نہیں بلکہ ادب برائے زندگی کے قائل تھے۔

''شہزادۂ اسلام کی خدمت میں'' نامی نظم میں شاعر نے شروع میں جس مایوسی اور قنوطیت کا اظہار کیا ہے وہ مایوسی موجودہ طریقہ ہائے زندگی سے ہے اور آخر تک پہنچتے پہنچتے وہ حضور ﷺ کا دامن پکڑتے دکھائی دیتے ہیں۔یعنی بین السطور یہ بات موجود ہے کہ حضور ﷺ کا لایا ہوا نظام آج بھی اپنی آب وتاب کے ساتھ موجود ہے اور انسان کی دنیاوی اور ابدی دونوں زندگیوں کی کامیابی کی ضمانت لیتا ہے۔

لیکن دلوں میں اب بھی حکومت ہے آپ کی
آہوں کی انجمن میں حکایت ہے آپ کی
ویران زندگی کو ضرورت ہے آپ کی
کچھ سر پھروں کے دل میں محبت ہے آپ کی
آباد پھر ہیں شوق کے ویرانے ان دنوں
نکلے ہیں غم میں آپ کے دیوانے ان دنوں ۲۲

''حدیث فردا'' میں وہ اہالیان اسلام کو اپنے مرکز کی طرف واپس آنے کی دعوت دیتا ہے علامہ اقبال نے جواب شکوہ میں کہا ہے کہ:

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہوکر
اور تم خوار ہوئے تارک قرآن ہوکر ۲۳

بالکل یہی بات انور اعظمی اپنے لب ولہجہ میں کہتے ہیں:

چھوڑ کر تو اپنا مرکز ہر طرف حیراں ہوا
قوم کو پوجا وطن کے نام پر قرباں ہوا
ننگ ملت باعث رسوائی انساں ہوا
چاک پنجہ سے تیرے قرآن کا داماں ہوا
اب اگر رخ اس قیامت سے بدل سکتا نہیں
اک صدی کے واسطے پھر تو سنبھل سکتا نہیں ۲۴

آخر میں مصر کے بادشاہ فاروق اور سعودی عرب کے شاہی خاندان کے مٹ جانے کی پیشین گوئی کی ہے جو یہودیوں کے مقاصد کو پورا کرنے میں مہرے کا کام دیتے رہے ہیں:

مٹ کے رہ جائیں گے ہوں فاروق یا ابن سعود
ہنس رہی ہے جن کی بے ربطی پہ تنظیم یہود

ختم ہوگا روئے انساں پہ مصائب کا ورود
تارے بجھ جائیں گے پھر ہے شاہ خاور نمود
قافلہ انساں کا نکلے گا پھر ظلمات سے
ہوتے جاتے ہیں نمایاں دن کے جلوے رات سے ۲۵

یہی رنگ ان کے دوسرے مسدس کا بھی ہے۔ ہر جگہ وعظ و تلقین کا انداز اور خطابانہ رنگ ہے۔ ''افسانۂ غماز'' میں مسلمانوں کے حالات اور اپنی تہذیب پر بیجا فخر کے حوالے سے کھلا ہوا چیلنج کرتے ہیں کہ:

فکر الحاد کہ جس فکر سے بیزار ہیں ہم
بے تکلف اسی آزار کے بیمار ہیں ہم
صرف اک وہم ہے یہ بات کہ دیندار ہیں ہم
ورنہ الحاد کے چنگل میں گرفتار ہیں ہم
گھومتی ہے اسی محور پہ سیاست اپنی
اسی الحاد پہ اٹھتی ہے جماعت اپنی ۲۶

ان کی نظر میں موجودہ نظام اور فکر نے زندگی کے کسی شعبے کو پاکیزہ نہیں رہنے دیا۔ ہر جگہ اسی کا بول بالا ہے جس سے اسلامی قدرون کو زوال ہے۔

معاملے اپنے ہیں ناپاک تجارت کالی
رشتۂ درد محبت سے جماعت خالی
سازشی پھول ہیں جاسوس ہے ڈالی ڈالی
دوستی برق سے رکھتے ہیں چمن کے مالی
یوں تو بیزاری کا اظہار بھی الحاد سے ہے
ربط پائندہ مگر پھر اسی جلاد سے ہے ۲۷

مسلم قوم میں در آنے والے ایک ایک نقص کی طرف اشارہ کر کے شاعر جس کے یہاں مایوسی کفر ہے اور جس نے کوشش پرواز کے لئے فضا کو تنگ بھی قرار دے چکا ہے وہی شاعر آخر میں کہتا ہے ۔

آیئے ختم یہ افسانۂ غماز کریں
فکر انجام کریں کوشش آغاز کریں
جانب بام حرم ہمت پرواز کریں
اپنی بیدار امنگوں پہ فقط ناز کریں
دہر مین جلوۂ آئین ِ الٰہی بن جائے
ہر مسلمان محمد کا سپاہی بن جائے ۲۸

انور اعظمی کی اردو شاعری کے مختلف موضوعات

مشرقی نوجوانوں نے انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں اعلی تعلیم کے حصول کے لیے مغرب کی دانشگاہوں کا رخ کیا۔ جس سے مشرق و مغرب کے درمیان علمی روابط بڑھے۔ مغرب کی ہر چیز کو بہت قریب سے دیکھا پرکھا اور اسکی قدروں کو پہچاننے کی کوشش کی ،مغرب کی چکا چوند کر دینے والی روشنی اور علم و ہنر کے پیچھے اس کے کمزور پہلوں تک بھی بعض لوگوں کی نگاہیں پہنچیں۔

تہذیب کے بڑھتے ہوئے سیلاب اور اس کے اثرات کے پیچھے چھپی ہوئی تباہی اہل نظر سے مخفی نہ رہ سکی جو دھیرے دھیرے پوری دنیا کو اپنے لپیٹ میں لے رہی تھی۔ انور اعظمی کے خیال میں اس مغربی تہذیب کے ریلے کا مقابلہ صرف اسلام کر سکتا ہے اور وہ اس روایتی اسلام کے جو صرف مسجدوں تک محدود ہو کر رہ جائے اس کے قائل نہیں ہیں بلکہ وہ اس اسلام کے قائل ہیں جو ہمہ گیر ہو، عدل و قسط پر مبنی ہو، انصاف دلا سکتا ہو، طاغوت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتا ہو۔ وہ مولوی کے روایتی لفظ کا سہارا لے کر پوری قوم کو اس بات پر ملامت کرتے ہیں کہ جن کا منصب قیادت و امامت ہے وہ اپنے حال پر مست و مگن کیوں ہیں بلکہ وہ اس اسلام کو چھوڑ دینے پر تیار نظر آتے ہیں جو دست نگر رہنے پر تیار ہو۔ ''فتنہ افرنگ'' میں کہتے ہیں۔

تقریر کا میداں ہو کہ تحریر کی وادی
مسٹر سے تو کچھ تیز ہی ملاّ کی ہے رفتار
طوفان بلاخیز ہے دنیائے عمل میں
سیلاب ہمہ گیر کی صورت دم گفتار
پوشیدہ نہیں اس سے تماشہ گہ الحاد
نیوٹن کے خیالات یا ہیگل کے ہوں افکار
ہر کام میں افرنگ کی ہفوات پہ تنقید

ہر بات میں قرآن کی آیات کی بھرمار
انسان کے لئے بس ہے خداوندی جمہور
اسلام کو کیا نظم و سیاست سے سرو کار
میں معتقد عظمت ملا تھا، سنی جب
یہ بات تو خود ہو گیا اسلام سے بیزار
میں نے کہا جب زیست کی گتھی نہ ہوئی حل
پھر کس لیئے کندھوں پہ اٹھائے پھروں یہ بار ۲۹؎

یاران حرم سے

''یاران حرم سے'' نامی نظم میں انور اعظمی نے مسلمانانِ عالم کو بالعموم اور اہل عرب کو بالخصوص جھنجھوڑنے کی کوشش کی ہے۔ انور اعظمی کے یہاں عشق و محبت کی معاملہ بندی کم ملتی ہے مگر جہاں ملتی ہے اس میں بھی اجتماعی مقصد پسندی اور قوت و تازگی کا اظہار ملتا ہے، چونکہ وہ اسلام اور دین حنیف کو مرکزیت دے کر سوچتے ہیں اس لئے ان کے رمز و کنایہ میں ایک معانی نہیں بلکہ اس میں مختلف پہلو نکلتے ہیں۔ معانی کے علاوہ محاسنِ کلام کے ظاہری انداز پر بھی نظر ڈالی جائے تو لفظی رعایتوں کو برتنے پر بھی اُسے پوری قدرت حاصل ہے۔ اس کے کلام میں لفظ و معنی کے لطیف امتزاج کی کمی نہیں ہے۔

انور اعظمی نے جس مرکزیت سے اپنے آپ کو جوڑے رکھا دوسروں کو بھی اسی مرکزیت سے جڑا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ اسی لئے وہ ''یاران حرم سے'' میں کہتے ہیں

آوارہ ہوا لشکر توحید تمہارا
یاران حرم! ہلتا ہے کعبہ کا منارا ۳۰؎

انور اعظمی کو مسلمانوں کے طرز زندگی سے شکایت ہے، ان کے خیال میں مسلمانوں میں دینی شعور کی کمی، حرارت ایمانی کا ضعف اور اسلامی غیرت کی کمی عام ہوگئی ہے۔ نفع طلبی اور مادہ پرستی نے عالم اسلام کو ہر طرف سے گھیر لیا۔ اس طرح کی نظموں میں ان کی صدائے ناقوس ذرا کمزور اور شکایت آمیز

معلوم ہوتی ہے۔مثلاً کہتے ہیں

لا دینی کا ایوان سیاست میں ہے ڈیرا
الحاد نے بازار معیشت کو ہے گھیرا
مسجد میں تو ذکر خدا دھوم سے تیرا
اڑتا مگر شان سے باطل کا پھریرا
بے جان ہے تکبیر کے سیلاب کا دھارا
یاران حرم! ہلتا ہے کعبہ کا منارا [۳۱]

یہی مایوسی ہمیں اقبال کے کلام میں بھی ملتی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ اب بلاد عربیہ میں بھی وہ سوز دروں نہیں ملتا ہے جس نے عربوں کو پوری دنیا میں ایک مقام عطا کیا تھا اور جو ان کا طرہ امتیاز رہا ہے۔عرب تو عرب عجم میں بھی وہ رعنائی افکار نہیں نظر آتی۔چنانچہ ''ذوق وشوق'' میں کہتے ہیں۔

کیا نہیں اور غزنوی کارگہ حیات میں
بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہل حرم کے سومنات
ذکر عرب کے سوز میں فکر عجم کے ساز میں
نے عربی مشاہدات نے عجمی تخیلات
قافلہ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں
گرچہ ہے تاب دار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات [۳۲]

انور اعظمی مسلمانوں کی زندگی اور ان کے عمل کو دیکھ کر انھیں ان کے آباء واجداد کے عزائم یاد دلا کر جھنجھوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔''یاران حرم ہلتا ہے کعبہ کا منارہ'' کی تکرار سے امید کی ایک کرن کہیں نہ کہیں ضرور نظر آتی ہے۔جس سے یہ تاثر پیدا ہوتا کہ اگر یہ بداعمالیاں رک جائیں تو کعبہ کے منارے کو جو خطرہ لاحق ہے وہ ٹل سکتا ہے کعبہ کو انور اعظمی نے رمز کے طور پر استعمال کیا ہے جو اسلام اور اہل اسلام کا مرکز ہے۔مسلمانوں کو عار دلاتے ہوئے کہتے ہیں

وہ مرد مسلماں ،وہ مجاہد وہ جیالے
کہسار ودمن جن کی امنگوں نے کھنگالے

راس آئے ہیں اب ان کی خوشامد کے نوالے
در در کے بھکاری ہیں پیالوں کو سنبھالے

اب ان کو نہیں نسبت ملت بھی گوارا
یاران حرم! ہلتا ہے کعبہ کا منارا ۳۳؎

اقبال مسلمانوں کی طرف سے جب مایوسی کا شکار ہوتے ہیں تو انہیں راکھ کا ڈھیر کہنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے ۳۴؎

اور کبھی کبھی یہ کیفیت اتنی شدید ہو جاتی ہے کہ انہیں روئے زمین پر انقلابی ذہن کا مالک یا مرد مسلماں کہیں نظر ہی نہیں آتا اور یہاں تک کہہ دیتے ہیں۔

تیرے محیط میں کہیں گوہر زندگی نہیں
ڈھونڈ چکا میں موج موج دیکھ چکا صدف صدف ۳۵؎

اس صورت حال کی فلسفیانہ توجیہ کبھی کبھی اس طور پر کرتے ہیں کہ مسلمانوں میں حب صادق اور عشق حقیقی کی چنگاریاں بجھ چکی ہیں۔ان کے جسموں میں خون نہیں رہ گیا ہے وہ چلتی پھرتی لاش بن کر رہ گئے ہیں۔ان کے سجدے بے شوق وذوق ہیں۔ کہتے ہیں

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے
مسلمانوں میں خون باقی نہیں ہے

صفیں کج دل پریشاں سجدے بے ذوق
کہ جذب اندروں باقی نہیں ہے ۳۶؎

انورا عظمی کعبہ یعنی اسلام کو درپیش خطرات کے کئی اسباب بتائے ہیں ان کے نزدیک ایک سبب مسلمانوں میں بڑی طاقتوں کی سلامی ہے یا دوسرے لفظوں میں تملقانہ جراثیم ہیں جن کی وجہ سے وہ حق بات کہنے سے محروم رہ جاتے ہیں اور دوسری چیز علماءِ امت ہیں جنھیں ملت کی باگ ڈور سنبھالنی تھی وہ ملت کی رہنمائی کر کے اسی کی کمائی پر گزارہ کرتے ہیں۔ کہتے ہیں

جن سے ہوا توحید کا پیغام گرامی
وہ دیتے ہیں الحاد کے پرچم کو سلامی

مکتب سے عطا ہوتی ہے دستار غلامی
تلقین ہے مدقوق خطابت ہے جذامی

خاموش ہوا سینہ ملت میں شرارہ
یاران حرم! ہلتا ہے کعبہ کا منارا

کیا کانپے گا الحاد کا دل شور اذاں سے
نکلے ہیں کہیں تیر بھی بوسیدہ کماں سے

مجبور ہے بیچارہ غم سود و زیاں سے
تقریر میں بے باک صداقت ہو کہاں سے

فتوے کی کمائی پہ ہے ملا کا گزارہ
یاران حرم، ہلتا ہے کعبہ کا منارا [۳۷]

وحدت آدم:

مسلمانوں کے انتشار نے مسلم قوم، خلافت اور مسلم شعائر کو کتنا نقصان پہنچایا ہے انورا عظمی نے جس وقت آنکھیں کھولیں تو یہ سب حادثات ہو چکے تھے مگر اس کے اثرات دھیرے دھیرے نمایاں ہونا شروع ہو گئے تھے۔

جدید مملکت کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ اپنے نظام فکر کو وطنیت کے اجتماعی فلسفے پر مبنی قرار

دیتی ہے۔ وطنیت ہی اس کا دین ہے اور یہی اس کا ایمان ۔ اپنے اعمال کو حق بجانب قرار دینے کے لئے وہ وطنیت کے جذبے کا سہارا لیتی ہے۔ مذہب کا دامن ہاتھ سے چھوٹا تو ضروری تھا کہ کوئی دوسرا مسلک یا زندگی کا نقطۂ نظر اس کی جگہ لیتا۔ چنانچہ وطنیت کے تصور نے کافی حد تک اس روحانی اور معنوی خلا کو اہل مغرب کی زندگی میں پر کیا جو مذہب کے ترک کرنے سے پیدا ہو گیا تھا۔ نظری حیثیت سے قومیت کے اصول کا تعلق انسانوں کی سیاسی گروہ بندیوں سے ہے۔ اس کے ذریعے سے اس تاریخی رجحان کا اظہار عمل میں آیا جس کا مقصد مسیحی عالمگیر مملکت کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے آزاد اکائیاں یا قومی مملکتیں قائم کرنا تھا اس کی بدولت ایسی نئی سیاسی تنظیم وجود میں آئی جس سے مختلف گروہوں کی نسلی اور لسانی انفرادیت برقرار رکھی جا سکے۔ اور ان میں سیاسی اور معاشی تعاون عمل کی راہ پیدا ہو اور سب کی دولت میں اضافہ ہو۔ اس تعاون عمل کی بہترین شکل یہ خیال کی جاتی ہے کہ ہر مملکت ایک قوم ہو اور ہر قوم ایک مملکت ہو۔

وطنیت کے تصور کا اظہار سیاست کے ذریعے اٹھارہویں صدی عیسوی کے وسط سے شروع ہوا اور انقلاب فرانس نے اس تصور کو اور زیادہ قوی کر دیا۔ بعد میں وطنیت کا اظہار مخصوص تہذیبوں کی ادبی تاریخی اور لسانی خصوصیات کے ذریعے سے کیا گیا۔ وطنیت کے جذبے کی ترقی کا نتیجہ یہ نکلا کہ عوام ایک مشترک سیاسی ہیئت میں منسلک ہو گئے ۔ اور تاجرانہ نفع پرستی کی گرم بازاری کے لئے اہل مغرب کو یہ نئے حالات بہت سازگار ثابت ہوئے ۔ بالآخر قومیت کی قبا اہل مغرب کے جسموں پر ایسی چست ہوئی کہ اس کو بالکل فطری خیال کیا جانے لگا۔ ہر قومی مملکت اپنے معاشی مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے مقدر کی تشکیل و تکمیل کے درپے ہو گئی ۔ اور اس میں دوسری جماعتوں کا کوئی لحاظ نہیں کیا گیا۔

آج وطنیت نے دین و اخلاق کی گدی پر قبضہ جما لیا ہے۔ مملکتی نظم و نسق کی وحدت اور معاشی مفاد کی یکسانیت سے قومیت کے جذبے کو نشو و نما پانے کا پورا موقع ملتا ہے ۔ جسے دوسری قوموں سے معاشی مقابلے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ آج قومیت یا وطنیت کا سیاسی تصور مملکت کی فطری بنا خیال کیا جاتا ہے۔ انور اعظمی اس تصور کو جو انسانوں کی اجتماعی ہیئت کی خاص تشکیل کرتا ہے اسلامی روایات کے خلاف سمجھتا ہے۔

وحدت آدم کو پارہ کرگئے قوم وطن ظلم انساں نے سجایا خوں سے انساں کا کفن
سرو کا سنبل مخالف، یاسمیں کی نسترن مختلف رنگوں سے ٹوٹی وحدت حسن چمن
ساری آنکھیں مضطرب ہیں حسن وحدت کے لیئے
رحم و ہمدردی ''وفا'' مہر و محبت کے لیئے ۳۸؎

موجودہ وطنیت کا جذبہ محض ایک مصنوئی چیز ہے۔ جدید تمدن کے بعض مخصوص حالات نے اس کی پیدائش اور نشو نما میں مدد دی۔ یہ دعوی کہ جس طرح انسان کو اپنے خاندان یا قبیلے سے محبت ہوتی ہے اسی طرح یہ محبت بڑھ کر قوم و وطن کی محبت بن جاتی ہے۔ یہ تاریخی اور منطقی طور پر صحیح نہیں ہے۔ خاندان کی محبت ایک قابل احساس جذبے کے تحت ہوتی ہے جب کہ وطنیت ایک پیچیدہ اور تجریدی احساس ہے جس کو صرف مخصوص تاریخی احوال اور معاشی تعلقات کی بدولت جذباتی حقیقت بن نے کا موقع ملتا ہے اور جہاں تاریخی حالات موافق نہیں ہوتے وہاں اس کے لیئے معاشی مفاد کی یکسانیت کے جذباتی حقیقت بننے میں بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں۔

انور اعظمی کو اس بات پر پورا ایمان ہے کہ ایک ہی کلمہ ہے جس کے ماننے والوں میں اس بات کی لیاقت ہے کہ وہ رنگ و نسل کے سارے بتوں کو توڑ دے اور اسی کی سربراہی میں من و تو کا فرق مٹ سکتا ہے جو وطنیت کی ساری زنجیریں توڑ کر سب کو ایک مسلک میں پرو کر اس جھوٹے اور بے حقیقت جذبے سے آزاد کرا سکتا ہے۔

دل میں ہوگا اب اسی پیر مغاں کا احترام جو پلائے ایک ہی انداز سے محفل میں جام
وہ جماعت ہوگی اب اقوام عالم کی امام جس سے محکم ہوگا سارے نوع انساں کا نظام
رنگ و نسل و مشرق و مغرب کی قیدیں توڑ دے
ایک انساں کے لئے سب کی محبت چھوڑ دے ۳۹؎

نسل، زبان، سیاسی و معاشی وحدت اور رسوم و روایات کی یکسانیت وطنیت کے جذبے کو پیدا کرنے میں معاون ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی عنصر بھی اجتماعی زندگی کی اساس نہیں کہا جا سکتا،

دراصل وطنیت کا جذبہ جدید تمدن کے نام سے بعض مخصوص مقاصد کے حصول کے لیے پیدا کیا گیا۔اور اس کی عمر دو ڈھائی سو برس پرانی ہے اس نے من مانے طور پر اپنی زندگی کی قدریں بنائیں اورانہیں قدروں کا سہارا لے کر وہ حق و باطل کا معیار طے کرتی ہے اس اندھے جذبے کے تئیں قومیں یہ بھول گئیں کہ جس طرح انفرادی زندگی میں خواہشوں اور میلانوں کی تحدید سے اخلاق وتمدن پیدا ہوتے ہیں اسی طرح جب تک قومیں اپنے اعمال پر تحدید عائد کرنا نہیں سیکھیں گی اس وقت تک دنیا میں امن وعافیت کا قیام ممکن نہیں اور نہ انسانیت کے مقاصد کو فروغ ہوسکتا ہے وطنیت کے اسی بت کو پاش پاش کرنے کی کوشش میں علامہ کہتے ہیں۔

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور ساقی نے بنا کی روش لطف وستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداوں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے [۴۰]

انوراعظمی کے نقطہ نظر سے وطنیت دراصل مرکز توحید سے اعوجاج، ملت کے لیے عار انسان کی رسوائی اور قرآن سے دوری ہے وہ ملت اسلام کے جیالوں کو اس مرض سے جلد نجات پانے کی بلکہ غلط رخ پر بہنے والے اس دھارے کا رخ بدلوانا چاہتے ہیں کہتے ہیں۔

چھوڑ کر تو اپنا مرکز ہر طرف حیراں ہوا قوم کو پوجا وطن کے نام پر قرباں ہوا
ننگ ملت، باعث رسوائی انساں ہوا چاک پنجہ سے ترے قرآن کا داماں ہوا
اب اگر رخ اس قیامت سے بدل سکتا نہیں
اک صدی کے واسطے پھر تو سنبھل سکتا نہیں [۴۱]

حجۃ الوداع کے موقع پر ہی آنحضرت ﷺ نے نسل ونسب کے تفاخر کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا تھا۔آپ نے فرمایا۔کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر اور کسی گورے کو کسی کالے پر اور نہ کسی کالے کو کسی گورے پر برتری اور فضیلت حاصل ہے سوائے تقوی کے اور تم سارے آدم سے ہو اور آدم

مٹی سے پیدا کیے گئے ہیں۔

قومیت کے اسی بت کے خلاف علامہ اقبال جا بجا احتجاج کرتے نظر آتے ہیں وہ بھی اس کو جدید تہذیب کی پیداوار اور دین کے لیئے غارت گر تصور کرتے ہیں۔ کہتے ہیں:

یہ بت کہ تراشیدہ تہذیب نوی ہے　　غارت گر کاشانہ دین نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے　　اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارہ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے [۴۲]

شہزادۂ اسلام کی خدمت میں

بعثت محمدی کا عظیم ناقابل فراموش احسان اور گراں قدر تحفہ یہ انقلاب انگیز اعلان ہے کہ اس کے نزدیک نہ کوئی چیز مستقل دین ہے اور نہ کوئی چیز مستقل دنیا۔ بلکہ نیت کی اساس پر ہر چیز اپنے اندر تاثیر پیدا کرتی ہے۔ بڑے سے بڑا دنیاوی عمل حتی کہ جنگ، تمتع اور جائز تفریح طبع سب کچھ دین بن جاتی ہے اگر تقرب الی اللہ کی نیت ہو اس کے برخلاف بڑے سے بڑا دینی کام جو رضائے الٰہی کے جذبے سے خالی ہو، خدا فراموشی اور غفلت کے ساتھ ہو وہ خالص دنیا اور ایسا عمل شمار ہوگا جس پر کوئی اجر و ثواب نہیں بلکہ بعض اوقات وبال جان کا موجب اور خدا سے دوری کا سبب بنے گا۔

پیغمبر اسلام ﷺ کا عظیم ترین معجزہ اور انقلاب انگیز اور عہد آفریں کارنامہ ہے کہ آپ نے دین و دنیا کی اس دوئی کو دور کیا اور ان بچھڑوں کو ملایا جو سیکڑوں بار ایک دوسرے کے خلاف تلواریں اٹھا چکے تھے۔

مذکورہ بالا تعلیمات کے خلاف پروان چڑھنے والے معاشرہ کو جب شاعر دیکھتا ہے، اور ہر طرف کی منافقت اور ریا کاری کی گرم بازاری سے اس کا سابقہ پڑتا ہے گفتار و کردار حتی کہ اسے دستار میں بھی فریب نظر آتا ہے تو اس پر ایک طرح کی کلی مایوسی کا غلبہ طاری ہوتا ہے اسے ہر طرف فریب ہی فریب نظر آتا ہے۔ مایوسی سے پیدا ہونے والی بدحواسی کے عالم میں وہ جلوے کو راز اور دست مسیحا کو فریب قرار دیتا ہے۔ اور اپنے درد کو ''درد لا دوا'' کے خانے میں ڈال دیتا ہے اس کے نزدیک ہر نغمہ ہر گفتار ہر جھنکار

یہاں تک کہ گردش زمانہ کا محوراور یہ نظام عالم بھی پرفریب معلوم ہوتا ہے۔

مادہ پرستانہ ذہنیت کا اس قدر غلبہ کہ ہر میدان کا فرد اسی چیز کو بیچنے اور اس کو بدنام کرنے پر تلا ہوا ہے جس سے وہ اپنی پہچان بنائے ہوئے ہیں اس کی نظر میں ہر چیز کا سودا ہو رہا ہے اور ہر چیز پر سود وزیاں کے نقطہ نظر سے نگاہ ڈالی جارہی ہے۔

میکش بہار ساغر و مینا کو بیچ دے
مجنوں ،تجلی رخ لیلی کو بیچ دے

راہب ہے گھات میں کہ کلیسا کو بیچ دے
موقع ملے تو شیخ بھی کعبہ کو بیچ دے

سود وزیاں مدار محبت ہے ان دنوں
زوروں پہ دوستی کی تجارت ان دنوں ۴۳؎

مایوسی کی اس شدید کیفیت اور غموں کی اس پیہم یلغار میں بھی شاعر کو اس بات کا شعور ضرور ہے کہ ان سارے دکھوں کا مداوا کہاں مل سکتا ہے۔ وہ اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ بیتابئ نظر کا مداوا کہیں یہ ہے بالکل اسی انداز میں مولانا حالی نے امت کا مرثیہ کہا ہے آخر میں خودسپردگی کا وہی جذبہ مولانا حالی کے یہاں بھی نظر آتا ہے جسے انور اعظمی نے اختیار کیا ہے۔

اقبال روح نبی ﷺ کو مخاطب کرتے اور امت کی پسماندگی پر آنسو بہاتے ہیں اور ایمان کی حرارت زندگی کی حرکت اور اس کی نایابی کا ماتم کرتے ہیں کہتے ہیں کہ آپ کی امت کا شیرازہ منتشر ہو گیا ہے اب یہ امت کہاں جائے اور کیا کرے زندگی کے اس طویل سفر میں آپ کی ملت کا حدی خواں پریشان ہے۔امت کے حال پر رحم فرمائیں

شیرازہ ہوا امت مرحومہ کا ابتر
اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے
وہ لذت آشوب نہیں بحر عرب میں

پوشیدہ جو ہے مجھ میں وہ طوفان کدھر جائے
ہر چند ہے بے قافلہ و راحلہ و زاد
اس کوہ وبیاباں سے حدی خواں کدھر جائے
اس راز کو اب فاش کر اے روح محمد ﷺ
آیات الٰہی کا نگہبان کدھر جائے ۴۴؎

علامہ اقبال ''پس چہ باید کرد'' میں بڑی منت کے انداز میں اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ تمہارا وجود اب بھی عالم کے لئے پیغام نو بہار ہے

اے وجود تو جہاں رانو بہار پر تو خود را دریغ از من مدار

کوکب تقدیر کے لٹ جانے کے باوجود، حدی خوانوں کی غیر موجودگی اور سارے منصوبوں کے ناکام ہو جانے پر بھی شاعر کو امید کی ایک کرن نظر آتی ہے اور وہ کرن نسبت کی کرن ہے، عامر عثمانی کی زبان میں:

تمہارے نام سے ہوتا ہے دل جواں اب بھی

انور اعظمی کو یقین ہے کہ ذرے کو آفتاب سے یہی نسبت ایک دن اپنا جلوہ دکھائے گی اور پوری ملت کے ساتھ ساتھ اس کی تابانی سے پوری دنیا منور ہوگی۔ شاعر اس بات پر مطمئن نظر آتا ہے کہ دکھوں کی اس بھیڑ میں غموں کی اس یورش میں آپ ہی کی حکایت موجود ہوتی ہے۔

لیکن دلوں پہ اب بھی حکومت ہے آپ کی
آہوں کی انجمن میں حکایت ہے آپ کی
ویران زندگی کو ضرورت ہے آپ کی
کچھ سر پھروں کے دل میں حجت ہے آپ کی
آباد پھر ہیں شو ق کے ویرانے ان دنوں
نکلے ہیں غم میں آپ کے دیوانے ان دنوں ۴۵؎

اس بند کے بعد آنے والے بند کی ترتیب شاعر نے اتنی منطقی رکھی ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے برسر پیکار فوج کو تازہ کمک پہنچ گئی ہو اور اس کے اندر عزم و حوصلہ پھر سے لوٹ آیا ہو" ڈھارس دلوں کو بخشے گا پیغام آپ کا" کہتے ہی شاعر کا لہجہ عزم سے پر نظر آنے لگتا ہے۔اور کہتا ہے

اٹھیے تو دست جبر سے شمشیر چھین لیں
باطل کے لب سے جادوئے تقریر چھین لیں
ابلیس کے طلسم سے تاثیر چھین لیں
الحاد کی کلاہ سے توقیر چھین لیں
گر بیکسوں کو آپ ذرا سا سنبھال دیں
ہم پھر زمیں کے ساتوں طبق کو اچھال دیں ؂۴۶

تحفہ افرنگ (مغربی تہذیب)

فلسفہ،شعر و ادب،تہذیب و تمدن اور دوسرے نظام فکر کے ذریعہ مغربی تہذیب کے اثرات،اس کے رموز،مادہ پرستانہ مزاج،خود پسندی،قومیت اور جانبدارانہ وطنیت کو اہل نظر نے بہت پہلے بھانپ لیا تھا اور اس کیخلاف قلم اٹھا لیا تھا انھیں ان تعمیری قدروں کا بھی خیال آیا جن سے یہ تہذیب خالی تھی اور اس کے رہنما بھی اس سے غافل تھے۔

انور اعظمی نے "تحفہ افرنگ" نامی نظم میں انگریزوں کے نظام حکمرانی اور ان کے افکار کے زیر اثر پروان چڑھنے والی تہذیب پر تنقید کی ہے۔اپنی تنقید میں انہوں نے اس بات کو بھی گوارہ نہ کیا کہ مغربی تہذیب کی ظاہری چمک دمک یا جمہوریت کے مثبت پہلوؤں کا تذکرہ بھی کر دیتے بلکہ وہ اس نظم کے شروع میں ہی سے اپنا نقطہ نظر مخالفانہ اختیار کئے ہوتے ہیں۔

مضطرب دنیا،زمانہ درد سے بے تاب ہے
آدمی کی مملکت میں آدمی نایاب ہے
عالم انسانیت معمور ہے کہرام سے
زندگی گھبرا رہی ہے صورت انجام سے ؂۴۷

انورا عظمی کی اس نظم کی ترتیب کو منطقی ترتیب سے دیکھیں تو انہوں نے سب سے پہلے زمانہ میں پھیلی ہوئی انارکی یا اضطراب کا ذکر کیا ہے ایسا اضطراب جس نے انسان سے انسانیت چھین کر دنیا کو ''گھٹ گئے انسان بڑھ گئے سائے'' کے مصداق بنا دیا ۔اپنی نظم کے پہلے بند کو شاعر نے بے دینی (سیکولزم) اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی آزادی فکر ونظر پر تنقید کرتے ہوئے یہ کہہ کر ختم کرتے ہیں کہ آزادی فکر ونظر خود ہی ایک زنجیر ہے۔

اس کے اور اگلے بند میں جمہوریت اور اس کے لوازمات کا ذکر کرتے ہوئے اسے فکر حاضر کا مصنوعی خدا قرار دیتے ہیں اور اپنے مخصوص انداز بیان میں احمقوں کی اہل خرد پر حکمرانی پر طنز کرتے ہوئے ''تل رہے ہیں سنگریزوں سے ترازو میں گہر'' کہہ کر آگے بڑھتے ہیں۔

تیسرے اور آخری بند میں ابلیس کے ترکش اور اس کے آزمودہ تیر کا ذکر کرتے ہیں جس سے ذہن فوراً ابلیس کی مجلس شوری کی طرف جاتا ہے جو علامہ اقبال کا ایک شاہکار ہے مغربی تہذیب پر تنقید علامہ اقبال کے یہاں بھی ملتی ہے

فسادقلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب
کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف

رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید
ضمیر پاک و خیال بلند وذوق لطیف ؎۴۸

علامہ کہتے ہیں کہ مغرب کے پاس بجلی کی روشنی ضرور ہے لیکن اس سے کوئی فکری راہ روشن نہیں ہوتی اور نہ عالم غیب کی نورانیت کی اس میں کوئی جھلک ملتی ہے۔

یہ عیش فراواں یہ حکومت یہ تجارت
دل سینہ بے نور میں محروم تسلی

تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے
یہ وادی ایمن نہیں شایان تجلی ؎۴۹

ابلیس کی مجلس شوری میں جب ایک مشیر اپنے نظام ابلیسی کے لیے جمہوریت کو سب سے

بڑا خطرہ قرار دیتا ہے۔

خیر ہے سلطانی جمہور کا غوغا کہ شر؟
تو جہاں کے تازہ فتنوں سے نہیں ہے باخبر ۵۰؎

تو دوسرا مشیر کہتا ہے کہ مجھے جمہوریت سے کوئی خطرہ نہیں ہے بلکہ میرے خیال میں یہ حکومت ہی کا ایک خوبصورت چہرہ ہے۔ ہمیں نے تو بادشاہی کو جمہوری لباس پہنایا ہے۔ اصل میں جب انسان ملوکیت سے اکتا کر بیزار ہو گیا تو ہمیں نے اسے جمہوریت کا کھلونا دے کر بہلایا ہے، ملوکیت کا مطلب ہی یہ ہے کہ انسان دوسروں کی کھیتی پر نظر رکھے اور جور و جبر یا مکر و فریب سے دوسروں کی چیزیں غصب کرے۔ مشیر جواب دیتا ہے

ہوں مگر میری جہاں بینی بتاتی ہے مجھے
جو ملوکیت کا اک پردہ ہو اس سے کیا خطر
ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر
کارو بار شہر یاری کی حقیقت اور ہے
یہ وجو د میر وسلطاں پر نہیں ہے منحصر
مجلس ملت ہو یا پر ویز کا در بار ہو
ہے وہ سلطاں غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر
تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر ۵۱؎

قید تنہائی

قید تنہائی میں انور اعظمی نے زمانے کے دستور پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے جہاں باطل حق پرستوں کو گوارہ نہیں کرتا۔ اس پر طرح طرح کے الزامات لگا کر اسے اپنے راستے سے ہٹانا چاہتا ہے۔ لیکن شاعر کو اپنی حق پرستی پر اتنا ناز ہے کہ اس کی کج کلاہی میں اس وقت بھی کوئی کمی واقع نہیں ہوتی جب

وہ باطل کے ہاتھوں میں پا بہ سلاسل ہے بلکہ اس حالت میں بھی ذرے ذرے کو اس پر حیرت ہے۔ قید تنہائی میں رہتے ہوئے اس کا دل اسے ڈھارس بندھاتا رہتا ہے۔ ماضی کی سنہری داستانوں کا ایک ایک باب اس کے ذہن کی سطح پر ابھرتا اور دلاسا دے کر واپس چلا جاتا ہے۔

رومی و حبشی نے آ کر اس طرح تسکین دی
کہ نکلتا ہی نہیں منھ سے بجز اللہ ہو
ابن حنبل نے اٹھائے راز مستی سے حجاب
پھر مٹے توحید سے لبریز ہے دل کا سبو ۵۲؎

طاغوت کا یہی وطیرہ رہا ہے کہ اس نے اہل حق کی آواز کو خاموش کرنے کے لئے کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا اور تاریخ شاہد ہے کہ اہل باطل کا نام لینے والے یا انہیں یاد رکھنے والے دو چار مگر اہل حق کی پیروی کرنے والے ہر دور میں کروڑوں انسان رہے ہیں۔

انفس و آفاق میں پھیلی ہے رسوائی مری
ایک عالم لے کے آئی قید تنہائی مری ۵۳؎

انور اعظمی کی اردو شاعری کا ایک تجزیاتی اور تنقیدی مطالعہ

انور اعظمی کی شاعری کا فن افادیت اور مقصدیت کے لحاظ سے ایک خاص تصور کے زیر نگیں معلوم ہوتا ہے وہ زندگی کے موجودہ ڈھرے اور صورت حال پر کسی طور مطمئن نظر نہیں آتے بلکہ اس کے خلاف ایک نعرہ بلند کر کے اپنے ماحول و معاشر کو اس سے آزاد کرانا چاہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے فن میں فرد کا یک گونہ کرب اور معاشرے کی زبوں حالی کی جھلک ہر قدم پر نظر آتی ہے، انہوں نے اپنے آپ کو جس ماحول میں پایا وہ آزادی ہند کے بعد کا زمانہ ہے، وہی ہندوستان جس کا خواب پچھلے سو سال سے دیکھا جا رہا تھا، لاکھوں انسانوں کے خون کی قیمت چکا کر جب آزادی ملی تو وہ آزادی اس غلامی سے اگر بری نہیں تھی تو بہت اچھی بھی نہیں تھی ،اتنی جانفشانی کے بعد ملنے والی آزادی کے زیر سایہ پلنے اور پروان چڑھنے بدنظمی ،ظلم اور اندھیر سے آنکھیں بچا کر کشاں کشاں گزر جانا ان کے لئے ممکن نہ تھا، اس مقام پر پہنچ کر ان کی شاعرانہ فکر ایک مرکزیت کی حامل نظر آتی ہے جسے ان کا دینی اور قرآنی شعور مستقل ایک غذا اور اساس فراہم کرتا رہتا ہے انور اعظمی نے معاشرے اور سماج کی اصلاح کی ذمہ داریاں اپنے سر لے لیں چنانچہ ان کی شاعری ایک خاص نظام فکر اور فلسفے کی تاریخ ہو کر رہ گئی جس کی جھلک ان کی شاعری میں جگہ جگہ ملتی ہے اس طرز فکر نے ان کی شاعری کو تھوڑا بہت محدود کر دیا۔

اک قوم ہے وہ جس کے ارادوں میں حوادث
اک قوم ہے وہ جو ہے حوادث سے نگوں سار
جس قوم کو کردار کی سطوت ہو فراہم
اس قوم کی شمشیر جہاں گیر وجہاں دار
وہ قوم کہ کردار کے عظمت سے ہے غافل
یا پھول کی تصویر ہے یا راکھ کا انبار
آجائے اگر ہاتھ میں شمشیر بھی اس کے

بن جائے گی اغیار کی عظمت کی وفادار
یہ نکتہ نہ موہوم نہ تاریک نہ مخفی
اقوام کی تعمیر کا سامان ہے کردار ۵۴؎

مذکورہ بالا اشعار اس بات کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ انور اعظمی کے افکار کا سرچشمہ اسلامی تعلیمات ہیں۔ وہ زندگی کے ہر شعبے، سیاست، معیشت اور معاشرت کو دینی زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہیں وہیں ادب اور فن کو بھی مقصدیت اور اسلامی جامہ میں پسند کرتے ہیں

میں ہوں زندہ نسبت ایثار ابراہیم سے
ورنہ مجھ پر بھی ہے یورش ظلمت ایام کی
اس جہاں میں جس میں برپا ہے ہمہ دم انقلاب
زندگی ہے سر خرو ایثار سے اقوام کی
معرکہ برپا ہر اک لمحہ حق اور باطل میں ہے
زندگی، یا کفر کی صف میں ہے یا اسلام کی
یا بتان عصر حاضر کی پجاری ہے حیات
یا غم تعمیر میں کعبہ کے سقف وبام کی ۵۵؎

....

اذانوں سے جن کی شب تار لرزاں
دعاؤں سے جن کی سحر آشکارا
وہ دھرتی کے سیوک اہنگوں نے جن کی
بیاباں بسائے گلستاں سنوارا
وہ آفاق کے مدعا کب اٹھیں گے
وہ غازی وہ پرچم کشا کب اٹھیں گے ۵۶؎

....

وہ ہنر مند ہیں قطرے کو جو طوفاں کر دیں

رنگ کانٹوں کو وہ بخشیں کہ گلستاں کر دیں
جہل کو جادوئے تقریر سے عرفاں کر دیں
کفر کو سحر فقیہانہ سے ایمان کر دیں
جرم ہے بات کو پابند صداقت کرنا
ایک الزام ہے اظہار حقیقت کرنا
ندرت فکر سے مفتی کی عبارت خالی
جلوہ ذکر سے صوفی کی کرامت خالی
حسن تدبیر سے تنظیم و سیاست خالی
لذت غم سے تری پوری جماعت خالی
درس گاہوں میں امامت کی سند بکتی ہے
خانقاہوں میں بزرگوں کی لحد بکتی ہے ۵۷؎

انور اعظمی کی شاعری میں روحانی تشبیہات

رہ گئی چاک گریباں میں الجھ کر دنیا
کس نے دیکھا ترے گیسو کا پریشاں ہونا
پھول بننے پہ کلی شاخ پہ دیکھی نہ گئی
حسن کی موت ہے خود حسن کا عریاں ہونا ۵۸؎

....

خار تو دامن صحرا میں بھی بس جائیں گے
کون ان پھولوں کو پوچھے گا گلستاں کے سوا ۵۹؎

....

دام زنجیر سے تا جلوہ گہ دارورسن
کام جاری ہے تری زلف کے سلجھانے کا ۶۰؎

....

رنگ شفق کو سمجھے تھے ہم خون آرزو
یہ کس نے مسکرا کے گلستاں بنا دیا ۶۱؎

....

کیا سمجھ پائے کوئی ان مست آنکھوں کے رموز
کچھ یہی میکش سمجھ پائے تو ساغر کہہ دیا ۶۲؎

مذکورہ بالا اشعار جن غزلوں سے لئے گئے ہیں ان غزلوں کے کہنے کا وقت مذکور نہیں جس سے ہمیں اندازہ کرنے میں دشواری ہو رہی ہے کہ شاعر کسی غیر متعین شاعرانہ مسلک پر یقین رکھتے ہوئے اپنے لیئے اظہار اور انفرادیت کے نئے امکانات کی کوشش میں مصروف ہے یا اپنے فن کی موجودہ وسعتوں پر مطمئن ہے ہاں اتنا ضرور رہے کہ ان تشبیہات میں معنوی گہرائی کے ساتھ ساتھ ایک جذبہ آرائش پوشیدہ ہے جس کے سبب شاعر کے لئے بعض دلکش شعری پیکروں کی تخلیق ممکن ہوتی ہے۔

شرک

قرآنی تعلیمات انسان کو آفاق وانفس میں بکھری ہوئی نشانیوں پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے اور چاہتا ہے کہ انسان آفاق وانفس میں غور وفکر کر کے کر فیصلہ کرے کہ اس کائنات میں دوئی کا کہیں شائبہ ہے؟

انور اعظمی اسی قرآنی نقطہ نظر سے کائنات پر غور کرتے ہیں اور کائنات میں پھیلی ہوئی مختلف نشانیوں کا تذکرہ کر کے کائنات کی چھوٹی بڑی ہر مخلوق کو ایمان سے سرشار قرار دے کر کہتے ہیں کہ ان میں سے ہر شے اپنے فرض منصبی کی انجام دہی میں ہمہ تن مصروف ہے۔ ابر و باد چرخ وزمین، برق وشرر ،سورج ستارے زمین حتی کہ ذرے کا نام اور اس کی حیثیت کا ذکر کر کے کہتے ہیں کہ وہ بھی اپنی جبیں کا بھرم نہیں کھوتا۔

یہ ابرو باد یہ چرخ وزمیں یہ برق و شرر
یہ لالہ و گل و نسریں یہ انجم و مہتاب
حدود فرض سے باہر نکل نہیں سکتے

تمام قافلے ہست و بود پا بہ رکاب
یہ آفتاب جلالت مآب ہے پھر بھی
کسی ستارے کا ماتھا جھکا نہیں سکتا
غرور اپنی بلندی پہ ہو اسے لیکن
فلک زمیں کی ہستی مٹا سکتا نہیں ۶۳؎

انور اعظمی نے بالا اشعار سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس کائنات میں ہر شے کا اپنا وجود اپنی حیثیت اور اپنی ہستی ہے کوئی بھی شے اپنے حدود سے تجاوز کرے گی تو اپنے اوپر ظلم کرے گی۔ اگلے بند میں موجودہ دور کی خدائی کا تذکرہ کرتے ہیں اور اس دور میں انسان کے جو مختلف قسم کے بت تراشے ہوئے ہیں اس پر چوٹ کرتے ہیں۔ان کے نزدیک جمہوریت ،قوم، ملک،افسر یہ سب کے سب نئے زمانے کے بت ہیں ان کی نظر میں یہ سب بت انسانی افکار نے تراشے ہیں۔

یہ قوم و ملک یہ جمہو ر افسر و مزددور
بتوں سے فکر نے محفل نئ سجائی ہے
کبھی تھا پیکر اصنام میں خدا کا ظہور
تو اس زمانے میں افکار کی خدائی ہے ۶۴؎

دراصل مذکورہ بالا اشعار میں جتنے ازم کا نام آیا ہے مذہب اسلام سے ان کا دور دور کا واسطہ نہیں ہے اس لئے انور اعظمی کی نظر میں ان کے خالق انسان ہیں۔اور ان ازموں کے آگے سر جھکانا یا ان کو مان لینا انسان کی عبادت کے مترادف ہے اسی لئے اگلے بند میں کہتے ہیں۔

معاف رکھیے عنایت سے حریت کی مجھے
کہ میں خدا کبھی انساں کو کہہ نہیں سکتا
جھکاوں اپنوں ہی جیسوں کے آگے پیشانی
خطا معاف وہ ذلت تو سہ نہیں سکتا ۶۵؎

مقاصد نبوی میں جس چیز کو سب سے نمایاں مقام حاصل ہے وہ یہی ہے کہ انسان کو انسان کی غلامی سے آزادی دلائی جائے اور اسے اس کے مقام و مرتبہ سے آشنا کیا جائے۔

یہی بات علامہ اقبال پیام مشرق میں اپنے اپنے انداز سے کہتے ہیں

آدم از بے بصری بندگی آدم کرد
گوہرے داشت و بے نزر قبا و جم کرد
یعنی از خوئے غلامی ز سگان خوار تراست
من ندیدم کہ سگے پیش سگے سر خم کرد ٦٦؎

چند لمحے ہلال عید کے ساتھ

مولانا حالی نے شعر کو اخلاق کا نائب اور قائم مقام کہا ہے گو کہ بیسویں صدی میں بعض شعراء نے اسے سیاست کا محکوم بنایا دیا، حالی کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے سماجی تصورات اور اخلاقی افکار میں شعریت دیکھی، یہی کام ترقی پسند ادب یا شاعری نے سیاسی افکار کی شعریت کو ڈھونڈھنے میں کیا گو کہ اخلاق مذہب، سیاست اور فلسفہ کو شعر کا رہبر قرار دیا گیا وہاں شاعری کے ساتھ پورا پورا انصاف نہیں کیا جا سکا، انور اعظمی اپنی شاعری میں کائنات کی جمالیات کا سہارا لے کر اپنے افکار کو عام کرنا چاہتے ہیں ،انہوں نے اپنی فکر کو اپنی شاعری کا محور قرار دیا، شعوری یا لاشعوری طور پر ان کے افکار ان کی شاعری میں آہی جاتے ہیں ''چند لمحے ہلال عید کے نام'' نامی نظم میں شاعر نے لمحہ بہ لمحہ بدلتے حالات اور اپنی تہذیب کے ماند پڑتے ہوئے اثرات اور اس سے بیدار ہونے والے اندرونی تلاطم کو چاند کے سامنے ظاہر کرتا ہے۔

ایسا نہیں کہ شاعر فلسفہ گردش ایام یا ''انما الدھر دول'' کا قائل نہیں مگر اسلام، اسلامی شعار، اور اسلامی تہذیب کی گرتی ساکھ اسے بے چین کیئے ہوئے ہے۔ اور اپنے فلسفہ کو وہ ایک طرف رکھ کر چاند کی زبانی وہی حقائق کہلوانا چاہتا ہے یا اپنے ایمان کی تصدیق کرانا چاہتا ہے۔

چاند کی زبان سے نکلا ہوا پہلا جملہ اسلام کی تعلیمات کا نچوڑ ہے ''دین غمخواری کا نام ہے'' اسی

بات کو چاند اپنی زبان سے یوں ادا کرتا ہے:

میں ہوں زندہ نسبت ایثار ابراہیم سے
ورنہ مجھ پر بھی ہے یورش ظلمت ایام کی
اس جہاں میں جس میں برپا ہے ہمہ دم انقلاب
زندگی ہے سرخرو ایثار سے اقوام کی ؎۶۷

چاند کی زبان سے بیان کیا گیا فلسفہ حق و باطل صرف یہی نہیں کہ شاعر کے سوال کا جواب ہے بلکہ اس میں شاعر کے لئے یک گونہ دلداری بھی پوشیدہ ہے۔ کہتا ہے۔

عشق دب سکتا نہیں ماحول کے نمرود سے
مرتعش اس کی اذاں سے تمکنت اصنام کی ؎۶۸

شاعر نے چاند کی زبانی جو کچھ کہلوایا ہے اس حقیقت علامہ اقبال کے اشعار میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی
آج بھی جو براہیم سا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے انداز گل ستاں پیدا ؎۶۹

آگ اور گلستاں کا استعارہ چاند نے بھی اپنی گفتگو میں استعمال کیا ہے

عشق مقصد کی تپش سے دل جو لذت یاب ہو
آگ بھی بن جاتی گلشن مجمر ایام کی ؎۷۰

نظم کے تیسرے بند میں چاند نے شاعر کو مزید حوصلہ دیا ہے کہ حق اور اہل حق آج بھی اپنے کام ہی مصروف ہیں۔ اگر چہ بہت کم ہیں یہ بند اس حدیث کی تفسیر معلوم ہوتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اسلام اجنبی بن کر آیا تھا اور ایک وقت آئے گا کہ وہ پھر سے اجنبی بن جائے گا ایسے وقت (فطوبی للغربا) نوید او

رخوشخبری ہے ان لوگوں کے لئے جو اجنبی بن کر رہیں مگر اسلام کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں اسی بند میں آگے اہل اسلام کے اندر در آنے والی کمزوریوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔

چوتھے بند میں جس کی منطقی ترتیب پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ چاند نے پہلے تو ایثار ابراہیم کی بات کی پھر موجودہ امت مسلمہ کے اندر در آنے والی خرابیوں کی نشان دہی کی اور پھر یہیں سے گویا شاعر کے انسانی ذہن میں پیدا ہونے والے اس سوال کا جواب دے رہا ہے کہ امت کو کیسا ہونا چاہیے اس امت کے سابقین اولین کیسے اور کس طرز عمل کے لوگ تھے۔

وہ لپٹ لو کی ،وہ شعلہ بار صحرا کی فضا
اور وہ گرم سفر اہل وفا کا کارواں
چند معصوموں سے وہ آبادی دشت حجاز
جن کی خاک پا سے پیشانی سجائے آسماں اے

نظم جیسے جیسے آگے بڑھتی ہے اسی قدر اس میں خطیبانہ رنگ و آہنگ کی آمیزش ہوتی جاتی ہے۔ بندہ مومن کے اندر چھپی ہوئی خفیہ صلاحیتوں کی طرف اشارہ کے ساتھ ساتھ طنز و تعریض کے نشتر کا سہارا بھی لیا جا رہا ہے۔

یہ قیامت ہے کہ تجھ کو خود ترا عرفاں نہیں
ورنہ مہلک کچھ تو ایسا وقت کا طوفاں نہیں
اپنی دہشت کی خبر لے تو کہ اے مجنوں ترے
ہیں جو بگولے جو نقاب روئے لیلیٰ بن گئے ۲ے

اس نظم میں غیر اللہ سیاست اور اس کے علاوہ دوسرے سہاروں کی طرف بڑھنے سے روکنے کے ساتھ اس خفیہ جذبے اور ایمانیات کو پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے آخری دونوں بندوں میں عمل میں اخلاص پیدا کرنے پر ابھارا گیا ہے انور اعظمی کے نزدیک کفر و اسلام ایک ساتھ نہیں رہ سکتے کوئی ان کے انضمام یا دونوں سے نباہ کی کوشش کرے تو اسے اپنے اخلاص کی خیر منانی چاہیے۔

''یا ایها الذین آمنو لا تتخذوا عدوی و عدوکم اولیاء تلقون الیهم بالمودة و انا اعلم بما اخفیتم و ما اعلنتم '' کی صورت میں قرآن جس بات کا اعلان کیا تھا وہی رنگ ڈھنگ زیر تذکرہ نظم کے درج ذیل بند کا ہے۔

کس قدر بیگانہ اخلاص ہے ایماں ترا
کفر کی خدمت بھی ہے نسبت بھی ہے اسلام سے
یہ وفاداری حرم سے ہے کہ توہین حرم
رونمائی بت کی ہوتی ہے خدا کے نام سے
کیا یہی تعبیر ہے خواب خلیل اللہ کی
سطوت طاغوت کا پرچم بنے احرام سے
رہنما الحاد ہے کردار میں تنظیم میں
یہ مسلمانی ہے یا ہے اک مذاق اسلام سے ۳ے

آخری بند میں شاعر نے چاند کی زبانی پیچھے بیان کردہ کوتاہیوں اور خامیوں کا نچوڑ اور ان کا علاج بتانے کی کوشش کی ہے

پھر جہاں میں تازہ کر آئین ایثار خلیل
پھر حرم کو جگمگا اخلاص کی تنویر سے
سہل کر ملت پہ ذوق جاں فروشی کا ہنر
حوصلے آزاد کر حالات کی زنجیر سے
منتظر ہے آج بھی دنیا ترے پیغام کی
اس کے فردا کی تجلی ہے سحر اسلام کی ۴ے

اسی سے ملتے جلتے عنوان کی نظم ہمیں علامہ اقبال کے یہاں بھی ملتی ہے ''غرۃ شوال یا ہلال عید'' میں علامہ نے چاند کی زبان سے اپنی اندرونی کشمکش کا حل نہیں پیش کرایا بلکہ چاند کو ایسے کردار میں پیش کیا

گیا ہے جس نے اپنے سر کی آنکھوں سے اسی مسلم قوم کے پیش رووں کا تزک واحتشام بھی دیکھا تھا دوسرے لفظوں میں علامہ نے صرف موجودہ حالات کو نظم کر دیا ہے۔اور ''یمتاز الشئی بضدہ'' کے اصول پر اس کا معنی مخالف قاری پر چھوڑ دیا ہے۔

اے ہمالہ

انور اعظمی کی نظم ہمالہ میں گیارہ بند ہیں جس میں شاعر نے ہمالہ کی خاموشی کو اس بات کا استعارہ قرار دیا ہے کہ اس کے دل میں کوئی بہت بڑی بات یا کوئی بہت بڑا دکھ چھپا ہوا ہے جس کی وجہ سے وہ ہر وقت خاموش کھڑا رہتا ہے

ہمالہ اور اس کے اردگرد پھیلے ہوئے فطرت کے حسن کا تذکرہ کر کے شاعر کہتا ہے کہ کائنات کے اتنے مناظر کے درمیان رہتے ہوئے بھی تو ہر وقت خاموش کھڑا رہتا ہے۔

جو ابھی تک شدت غم سے زباں خاموش ہے
وہ خاموشی جس میں کوئی داستاں رو پوش ہے ۵ے

آگے کے چار بند میں شاعر نے اپنے تخیل کو بروئے کار لا کر ابر کے ٹکروں، ہوا کے نرم جھونکوں ،شکستہ دل کی آہوں اور فغاں زیر لب سے تعبیر کیا ہے اخیر کے پانچ بند جو شاعر نے پہاڑ کی زبانی کہلوائے ہیں اس میں اپنے افکار و نظریات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے، آزادی فکر و نظر اور اس کے اثرات پر چوٹ کی ہے ۔اور آگے وہی بات کہہ دی ہے جس کو علامہ اقبال نے اپنے لہجہ میں کہا ہے:

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آلباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں ٦ے

اور انور اعظمی کہتے ہیں:

ذوق سجدہ ان گھروندوں سے بہل سکتا نہیں
بے خدا، کے کام پیشانی کا چل سکتا نہیں ۷ے

یعنی علامہ اور انور اعظمی دونوں کے نزدیک انسانی فطرت میں یہ بات ودیعت کر دی گئی ہے کہ وہ

کسی کے آگے جھک کر نیاز مندی اور انکساری اختیار کرے ۔کسی نہ کسی کے آگے اپنی مجبوریاں اور ضرورتیں رکھے اسے حاجت روا جانے اقبال کی نظم ہمالہ کا رنگ بھی وہی ہے جوزیرنظرنظم کا ہے۔اقبال کی نظم شاعری کےاس دور میں شامل ہے جو۱۹۰۵ءتک محیط ہے،اس وقت تک کی گئی ان کی شاعری میں ہمیں وہ پیغام ابدی نہیں ملتا جو یورپ سے واپسی ۱۹۰۸کے بعد کی گئی شاعری میں ملتا ہے،اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال کے ہمالہ میں فطرت میں بکھری ہوئی نشانیوں اور قدرتی مناظر کی بھرپور فضا ملتی ہے مگر اس کا انداز ہمالیہ پہاڑ کی عظمت کے اعتراف کے ساتھ ساتھ رومانیت کا بھرپور رنگ لیئے ہوئے ہے۔

آخری بند میں اقبال ہمالہ سے منت سماجت کرتے نظر آتے ہیں کہ پچھلے وقت کی کوئی داستان سناو۔ایسا لگتا ہے جیسے پرتکلف زندگی سے گھبرایا ہوا کوئی شخص کچھ وقت فطرت کی گود میں گزارنا چاہتا ہے

اے ہمالہ داستاں اسوقت کی کوئی سنا
مسکن آبائے انساں جب بنا دامن ترا
کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا
داغ جس پر غازہ رنگ تکلف کا نہ تھا

ہاں دکھا دے اے تصور ! پھر وہ صبح وشام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو ۸ے

پندرہ اگست

انور اعظمی نے آزادی کی جدوجہد،اس کی حسرت،اہل وطن کی اس کی راہ میں پیش کی جانے والی قربانیوں اوراس کے حصول پر باندھے جانے والی امنگوں اورآرزووں کواپنی آنکھوں سے دیکھا تھا،اس کے حصول کے بعد آنے والے نتائج نے انھیں کس درجہ مایوس کیا اس کا اندازہ ان کی نظم سے بخوبی ہوتا ہے

پہلے اور دوسرے بند میں شاعر نے غیر انسانی حرکتوں کا تذکرہ کر کے آزادی سے پہلے اہالیان ہند کے ذہن کی عکاسی کی ہے جس کے مطابق اہل ہند عموما سوچا کرتے تھے کہ ہمارے اوپر ساری مصیبت سامراج کی وجہ سے ہے،اس کے خونی پنجوں سے نجات پا کر ہم خوش حال اور سارے مصائب

سے آزاد ہو جائیں گے۔

دوسرے بند میں شاعر نے کچھ جھنجھلاہٹ کے انداز میں کہا ہے کہ اب تو ''قوم سفید'' کی رخصتی ہو چکی ہے۔اب تو ہم اپنی مرضی اور اپنے اصولوں کے خالق اور جمہوریت کے محافظ ہیں مگر۔۔۔۔

پھر بھی پھیلا ہوا یاس کا دور ہے
حریت کا افق گرد آلود ہے
اژدہے قید و زنداں سے آزاد ہیں
ملک میں لاکھوں عفریت آباد ہیں

ظلم کی دھند وحشت کی برسات ہے
اب بھی تہذیب کی ملک میں رات ہے
شہر سنسان ہے موت کا راج ہے
زندگی کا شہنشاہ بے تاج ہے ۷۹

اس میں زندگی کے مختلف میدانوں میں پھیلی ہوئی بدعنوانیوں کا تذکرہ ہے۔رہبری ہو یا مہربانی،تجارت ہو یا انصاف ہر جگہ خلفشار مچا ہوا ہے۔

شاعر نے امیری اور غریبی کے بیچ بڑھتی ہوئی خلیج اور اس کے نتیجے میں پروان چڑھتے ہوئے انتقامی جذبے کی طرف بھی اشارہ کیا ہے

اک طرف زر پرستی سیہ کاریاں
اک طرف انتقاما تبہ کاریاں ۸۰

اس کے بعد ایک بار پھر اپنی خون ہوتی ہوئی آرزووں کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ جب یہ ساحر یہاں سے نکل جائیں گے تو ہم آدمیت کے سانچے میں ڈھل جائیں گے۔

پر یہ کیا اے طلسمات کی سر زمیں
چاند نکلا ہے لیکن اجالا نہیں ۸۱

اس کے بعد شاعر مقدس سرزمین ہندوستان کی محرومی کا تذکرہ کر کے کہتا ہے کہ تیری گود میں آج انسان کا نام ونشاں نہیں، کیا مری آرزوئیں اور امنگیں یوں ہی مر جائیں گی؟

اس کے بعد فوراً شاعر کہتا ہے کہ نہیں عقل تو یہی مانتی ہے کہ یہ تمہاری آرزوؤں کی دنیا ہے اور دل کہتا ہے کہ تم اس محفل میں تنہا نہیں ہو تمہاری طرز پر سوچنے والے اور بھی ہیں۔

عقل کہتی ہے یہ تری دنیا نہیں   دل یہ کہتا ہے ، محفل میں تنہا نہیں

دور اک کارواں محو رفتار ہے

جو خدایان حاضر سے بیزار ہے ۸۲

اس کے بعد اپنی مرکزیت کی طرف لوٹتے ہیں اس مرکزیت اور فکر کی طرف جس کے وہ علمبردار ہیں اور توحید کا نعرہ مستانہ چھیڑتے ہیں اور امید ظاہر کرتے ہیں ایک قافلہ جو محو رفتار ہے اس کی رسائی ایک نہ ایک دن ہم تک ہو کر رہے گی اس لئے آزادی درحقیقت آب وگل کی خدائی سے بیزار ہے

کلیات اقبال میں آزادی کے نام سے تین نظمیں ملتی ہیں آزادی نسواں ،آزادی کل افکار، آزادی، اور آزادی فکر یہ نظمیں قطعے رباعی یا چھوٹی غزل کی شکل میں ہیں۔آزادی افکار زیر تذکرہ نظم سے غیر متعلق ہے اس کو علامہ نے:

آزادی افکار ہے ابلیس کی ایجاد ۸۳

کہہ کر خارج کر دیا ہے۔، ہمارے لیے یہ آزادئ نسواں

کا محل نہیں۔''آزادیٔ'' میں بھی علامہ نے آزادی افکار ہی کو نشانہ بنایا ہے اور یہ کہہ کر

چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد

قرآنی تعلیمات کو اور اس کے افکار کو کھلونا بنائے جانے پر طنز کیا ہے اور اخیر میں

ہے مملکت ہند میں اک طرفہ تماشہ

اسلام ہے محبوس مسلماں ہے آزاد ۸۴

کہہ کر اس نظم کو ختم کیا ہے

حرم تلاش میں ہے

یہ نظم خطابانہ نیز شکوہ آمیز ہے۔خطاب کا رخ موجودہ مسلمانوں کی طرف ہے اور یہ خطاب حرم کی زبان سے کرایا گیا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کے بیشتر مضامین جواب شکوہ از علامہ اقبال سے لئے گئے ہیں جواب شکوہ اور زیرنظر نظم ایک ہی بحر کی ہے:

ایک دن وہ تھا کہ امت تھی یہی مجھ پہ نثار
میرے ہاتھوں میں رہی اس کی امنگوں کی مہار
اس کی امیدوں کی مرکز تھی یہ میری دیوار
اس کے ہنگاموں کے محور تھے یہ مرے کہسار ۸۵؎

علامہ کہتے ہیں

وہ بھی دن تھے کہ یہی مایہ رعنائی تھا
نازش موسم گل لالہ صحرائی تھا
جو مسلماں تھا اللہ کا سودائی تھا
کبھی محبوب تمہارا یہی ہر جائی تھا ۸۶؎

....

انور اعظمی کہتے ہیں

مجھ کو باطل کے خداوں سے چھڑایا اس نے
میرے در کو حرم پاک بنا یا اس نے
میری محراب کو اشکوں سے سجایا اس نے
میرے کوچے میں دل و جان لٹایا اس نے
قو م کو چھوڑا میرے عشق میں گھر کو چھوڑا
نخوت عظمت اجداد و پدر کو چھوڑا ۸۷؎

علامہ کہتے ہیں:

صفحہ دہر سے باطل کو مٹایا کس نے

نوع انساں کو غلامی سے چھڑایا کس نے
میرے کعبے کو جبینوں سے بسایا کس نے
میرے قرآن کو سینوں سے لگایا کس نے

تھے تو آبا وہ تمہارے ہی مگر تم کیا ہو
ہاتھ پہ ہاتھ دھرے منتظر فردا ہو ۸۸؎

علامہ اقبال کا بند جو جواب شکوہ میں ہے ''صفحہ دہر سے باطل کو مٹایا کس نے؟ اسی کے آخری حصے کو:

تھے تو آبا وہ تمہارے ہی مگر تم کیا ہو
ہاتھ پہ ہاتھ دھرے منتظر فردا ہو

انورا عظمی نے بالکل اسی طرح اپنے پیرائے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے

اسی امت سے ہو تم سخت ہی حیرت مجھ کو
دیکھ کر تم کو ہے اپنے سے شکایت مجھ کو
تم سے نسبت پہ تو ہوتی ہے ندامت مجھ کو
کس نئے طرز کی دی ہے یہ محبت مجھ کو

وقت فرصت کا جو مل جائے تو آجاتے ہو
اور اس طرح کہ احسان کئے جاتے ہو ۸۹؎

انورا عظمی نے اپنی نظم میں جو مضامین باندھے ہیں، اگر یہ کہا جائے تو شاید بیجا نہ ہوگا کہ انہوں نے علامہ اقبال کے جواب شکوہ کو ذرا توسیعی رنگ دینے کی کوشش کی ہے اس لیے کہ

ہر کوئی مست مئے ذوق تن آسانی ہے
تم مسلماں ہو یہ انداز مسلمانی ہے ؟
حیدری فقر ہے نے دولت عثمانی ہے
تم کو اسلاف سے کیا نسبت روحانی ہے ؟
وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر

اور تم خوار ہوئے تارک قرآں ہو کر ۹۰

کووسعت دی جائے تو اس میں وہ جھوٹی سیاست، کذب بیانی اور افترا پردازی بھی آجائے گی تو آج کا شعار ہے موجودہ دور کے طلسمات کے لیے بھی اس وسعت میں جگہ نکلے گی اور وسوسہ فردا اور مستقبل کے تعلق سے پریشان حالی کے لئے بھی اس نظم میں انور اعظمی پوری طرح علامہ اقبال سے متاثر نظر آتے ہیں۔انور اعظمی بھی مسلمانوں کی زبوں حالی کا ذمہ دار خود مسلمانوں کو قرار دیتے ہیں۔

تاج محل

تاج محل میں انور اعظمی کا فن عروج پر ہے۔ابتدا میں انہوں نے جو صبح کی منظر کشی کی ہے اس کے الفاظ کا تزک واحتشام شاعر کے دل کی اثر پذیری پر دلیل ہے اس میں استعمال ہونے والی تشبیہات بڑی اچھوتی قسم کی ہیں۔

چار سو مینار استادہ مثال پاسباں
دم بدم دریائے جمنا چومتا ہے آستاں ۹۱

اس نظم میں فطرت سے عشق، تاج محل کے حسن سے مرعوبیت، روحانیت اور اسی کے ساتھ ساتھ شاعر نے اپنے فرض یعنی حق گوئی کو اتنے خوبصورت انداز میں نبھایا ہے کہ جو ایک مشاق شاعر ہی کر سکتا ہے:

اس لئے کہ شوخی مہتاب کو رسوا کرے
پھر کبھی وہ حوصلہ نہ خود نمائی کا کرے ۹۲

شاعر کی نگاہ صرف تاج محل کے حسن اور اس کے تزک واحتشام میں الجھ کر نہیں رہ گئی بلکہ اس نے مزید غور کیا تو اسے اس کے درودیوار پر اغیار کی پرچھائیاں چلتی پھرتی نظر آئیں اور یہیں سے اس نے گریز کر کے اپنی حق گوئی کے لئے ایک سراپا لیا۔

ملک کی دولت سے قائم عشق خرّم کا بھرم
منت مزدور سے پشت درو دیوار خم
کتنے ہاتھوں کی تھکاوٹ سے ہوا ہے سرخرو
جو ٹپکتا ہے جبیں سے قلب انساں کا لہو ۹۳

اس کے بعد شاعر نے وہ بات کہہ دی جو انہیں بظاہر کمیونسٹوں کی صف میں لا کھڑا کرتی ہے۔ مگر ان کی دوسری نظموں سے ظاہر ہوتا کہ وہ کمیونزم کے علمبردار نہیں ہیں بلکہ قوم کی دولت کو اسی طرح ذاتی شوق کی تکمیل میں صرف کرنے کے خلاف ہیں اسی لئے کہتے ہیں کہ

ایک قطرہ شہ جہاں کے دل کا بھی ہو تا اگر
تو چراغ عشق کا ہوتا وہ تا بندہ گہر ۹۴

تعلیمات اسلام کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو شاعر کی نظر اسلام نے ہر چیز کی حتیٰ کہ عشق کی حدیں بھی مقرر کر دی ہیں جب کہ ذوق نظر اور اس کے تقاضے کچھ اور ہی مطالبہ کرتے ہیں آخر کار شاعر اپنے فیصلے پر مہر ثبت کرتا ہے کہ:

عقل کچھ کہتی ہے دل کا اور ہی پیغام ہے
تاج !تو بھی باعث رسوائی اسلام ہے ۹۵

حواشی

۱-	نالہ شب، انور اعظمی، مکتبہ الحسنات، دہلی ص ۱،
۲-	نالہ شب، ص نمبر ۳۴
۳-	نالہ شب، ص ۲۳
۴-	نالہ شب، ص ۱۲۳
۵-	نالہ شب، ص: ۷۰-۷۱
۶-	اردو شاعری کا مزاج، ڈاکٹر وزیر آغا، ص ۳
۷-	نالہ شب، ص: ۱۳۶-۱۳۷
۸-	ایضاً، ص: ۶۰
۹-	ایضاً، ص: ۳۶
۱۰-	ایضاً، ص: ۶۰
۱۱-	ایضاً، ص: ۹
۱۲-	ایضاً، ص: ۲۲
۱۳-	ایضاً، ص: ۲۴
۱۴-	ایضاً، ص: ۲۷
۱۵-	ایضاً، ص: ۴۵
۱۶-	اذان سحر، ص: ۲۶۸
۱۷-	ایضاً، ص ۳۱۹
۱۸-	ایضاً، ص: ۳۱۷
۱۹-	ایضاً، ص: ۹۱
۲۰-	ایضاً، ص: ۸۴

۲۱- ایضاً،ص:۸۸

۲۲- کلیات اقبال،علامہ اقبال،ص:۱٦۷

۲۳- اذان سحر،ص:۱۰۱

۲۴- ایضاً،ص:۱۰۱

۲۵- ایضاً،ص:۲۷٦

۲٦- ایضاً،ص:۲۷۷

۲۷- ایضاً،ص:۲۷۹

۲۸- ایضاً،ص۸۴-۱۸۳

۲۹- ایضاً،ص۲۹۳

۳۰- ایضاً،ص۱۲۹۳

۳۱- ایضا،ص۲۹۳

۳۲- کلیات اقبال،ص۳۳۳

۳۳- اذان سحر،ص:۹۴،۲۹۳

۳۴- کلیات اقبال،ص۳۴۴

۳۵- کلیات اقبال،ص:۲۷۲

۳٦- کلیات اقبال،ص:۳۰۹

۳۷- اذان سحر،ص:۲۹۴

۳۸- ایضاً،ص:۹۹

۳۹- ایضاً،ص:۹

۴۰- کلیات اقبال،ص:۱۳۲،۱۱۳۳

۴۱- انور اعظمی،اذان سحر،ص:۲۱۰۱

۴۲- علامہ اقبال:کلیات اقبال،ص۱۳۳

۴۳- انور اعظمی، اذان سحر، ص: ۸۶،۸۵

۴۴- کلیات اقبال، ص: ۴۲۹

۴۵- اذان سحر، ص: ۸۸-۸۷

۴۶- ایضاً، ص: ۸۸

۴۷- ایضاً، ص: ۱۷۲

۴۸- کلیات اقبال، ص: ۴۴۸

۴۹- ایضاً، ص: ۵۰۴

۵۰- ایضاً، ص: ۵۴۱

۵۱- ایضاً، ص: ۵۴۱

۵۲- اذان سحر، ص: ۹۸

۵۳- ایضاً، ص: ۹۸

۵۴- ایضاً، ص: ۱۸۱

۵۵- ایضاً، ص: ۱۱۱،۱۱۰

۵۶- ایضاً، ص: ۱۲۲

۵۷- ایضاً، ص: ۲۹، ۱۲۸

۵۸- نالہ شب، ص۲

۵۹- ایضاً، ص۶

۶۰- ایضاً، ص۱۰

۶۱- ایضاً، ص۱۵

۶۲- ایضاً، ص۲۵

۶۳- اذان سحر، ص: ۱۶۴

۶۴- ایضاً،ص:۱۶۵

۶۵- ایضاً،ص:۱۶۵

۶۶- کلیات اقبال،ص۱۳۴

۶۷- اذان سحر،ص:۱۱۱

۶۸- ایضاً،ص:۱۱۱

۶۹- کلیات اقبال،ص:۱۶۸-۱۸۱

۷۰- اذان سحر،ص:۱۱۱

۷۱- ایضاً،ص:۱۱۲

۷۲- ایضاً،ص:۱۱۴

۷۳- ایضاً،ص:۱۱۶

۷۴- ایضاً،ص:۱۷،۱۱۶

۷۵- ایضاً،ص:۱۹۷

۷۶- کلیات اقبال،ص۲۲۹

۷۷- اذان سحر،ص۱۹۹

۷۸- کلیات اقبال،ص:۲۲

۷۹- اذان سحر،ص۱۸۹

۸۰- ایضاً،ص۱۸۹

۸۱- ایضاً،ص۱۸۹

۸۲- ایضاً،ص:۱۹۰

۸۳- کلیات اقبال،ص:۳۸۳

۸۴- ایضاً،ص۴۴۰

۸۵- اذان سحر، ص:۱۰۵

۸۶- کلیات اقبال، ص:۱۶۴

۸۷- اذان سحر، ص:۱۰۵

۸۸- کلیات اقبال، ص:۱۶۵

۸۹- اذان سحر، ص:۱۰۷

۹۰- کلیات اقبال، ص:۱۶۷

۹۱- اذان سحر، ص ۲۳۷

۹۲- ایضاً، ص:۲۳۸

۹۳- ایضاً، ص:۲۴۰

۹۴- ایضاً، ص ۲۴۱

۹۵- ایضاً، ص:۲۴۲

باب پنجم

خلاصہ

خلاصہ

ضلع اعظم گڈھ یو پی کے شمال مشرق میں واقع ہے۔جس کا نام راجہ اعظم خاں نے ۱۶۶۵ء میں اپنے نام کی نسبت سے اعظم گڈھ رکھا اور بسایا۔علوم وفنون کے اعتبار سے یہاں کے لوگوں نے بہت بلند مقام حاصل کیا ہے۔زندگی کے ہر شعبے میں اسے سبقت حاصل ہے۔مذہبیات،ادبیات،نثر نگاری،شاعری،فکشن، تنقید،تاریخ یا فلسفہ ہو اعظم گڈھ نے سب کو بام عروج پر پہنچایا ہے۔اسی لئے علامہ اقبال خاں نے یہاں کے ہر ذرہ کو نیر اعظم کہا ہے کیوں کہ یہاں کے ہر ذرہ میں آفتاب بجا طور پر پنہاں ہے۔

یہاں کی زرخیز مٹی سے بڑے بڑے نامور علماء،ادباء،مورخین اور اولیاء اللہ پروان چڑھے جنھوں نے علم وفن،تحقیق وتصنیف کے مختلف میدانوں میں وہ گراں قدر خدمات انجام دیں جنھیں تاریخ میں سنہری حرفوں سے لکھا جاتا ہے جن میں سے چند مشہور ومعروف نام مثال کے طور پر درج کئے جاتے ہیں۔مولانا فاروق چریا کوٹی،علامہ شبلی نعمانی،مولانا وحیدالدین فراہی،مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری،مولانا عبدالسلام ندوی ،مولانا اسلم جیراج پوری،مولانا ابوالیث اصلاحی ندوی،مولانا امین احسن اصلاحی،مولانا احمد محمود اصلاحی،انور اعظمی،اقبال سہیل،کیفی اعظمی،شمس الرحمٰن فاروقی،مہاپنڈت راہل سانسکرتائن،شیام نرائن پانڈے،اجودھیا سنگھ اپادھیائے اور ہری اودھ کملا کانت وغیرہ۔

موجودہ اعظم گڈھ مشرقی یو پی کا ایک ذرخیز علاقہ ہے اس کے شمال میں گھاگھرا ندی،گورکھپور،ضلع دیوریا موجود ہے۔جنوب میں غازی پور اور جونپور آباد ہیں،پچھّم میں فیض آباد اور سلطان پور ضلع واقع ہے اور پورب میں اس کی سرحدیں غازی پور اور بلیا سے ملتی ہیں۔یہ ضلع مغرب سے مشرق تقریبا ۲ےمیل لمبا اور شمال سے جنوب تقریبا ۵۶ میل چوڑا ہے اس کا کل رقبہ دو ہزار ایک سو چالیس ۲۱۴۰ مربع میل ہے۔پہلے اس کا حصہ چکلہ اعظم گڈھ مع پرگنہ ماہل،مئو ناتھ بھنجن اور مبارک پور ضلع گورکھپور میں شامل تھا۔یہ علاقہ ۱۰ نومبر ۱۸۰۱ء گورنر جنرل لارڈ ولزلی اور اودھ کے نواب سعادت علی خاں کے درمیان ایک معاہدے کے تحت انگریزوں کو ملا تھا اور ایسٹ انڈیا کمپنی میں شامل کرلیا گیا تھا۔

گھا گھرا ندی جب اپنی جگہ سے شمال کی طرف بڑھ گئی تو یکم اکتوبر۱۹۰۴ءکواعظم گڈھ ضلع میں ایک سو دو(۱۰۲) گاؤں کا اضافہ ہو گیا جن کا مجموعی رقبہ ۶۷ مربع میل ہے۔اعظم گڈھ ضلع مکمل طور پر ایک ہموار میدانی علاقہ ہے جسے قدرتی اعتبار سے تین حصوں میں تقسیم کیا جا تا ہے(۱) گھا گھرا ندی کا کچھار(۲) ٹونس ندی کا بیسن (۳) دکھنی حصہ۔

اعظم گڈھ کا شمار صوبہ کے ذرخیز ضلعوں میں ہوتا ہے۔عام طور پر یہاں کی ہوا گرم اور خشک ہے ۔یہاں کے باشندے تینوں موسموں سے خوب اچھی طرح لطف اندوز ہوتے ہیں۔یہاں کے لوگ بہت زیادہ محنتی اور جفاکش ہوتے ہیں۔اس ضلع کی خاص پیداوار دھان، گیہوں چنا،مٹر، جوار باجرہ،خربوزہ،تربوزہ گنا اورشکرقند ہیں۔

اعظم گڈھ کی علمی اورادبی تاریخ کا سلسلہ باقاعدہ سالار مسعود غازی اوران کے رفقاء کار کے زمانے سے ہی شروع ہوجاتا ہے،ان کے اصحاب نے جماعت کی شکل میں نکل کرمختلف علاقوں میں علم وفن کا چرچا عام کیا ،اس کے بعد سلطان شہاب الدین غوری نے ۵۹۰ ھ میں قنوج کے علاقے کو فتح کرتے ہوئے بنارس، گوالیار،اوراس کے اطراف کےعلاقوں کواسلامی سلطنت میں شامل کیا۔جس کا ایک حصہ موجودہ اعظم گڈھ بھی تھا اسی عہد سے اس علاقے میں مسلمانوں کا فی الجملہ عمل دخل شروع ہوا اور وہ اپنے دینی اور علمی امتیازات کے ساتھ ابھرے۔اس کے بعد ہر زمانے میں چاہے وہ غلاموں کا دور رہا ہو یا خلجیوں کا،حکمرانوں کا زمانہ رہا ہو یا مغل بادشاہوں کا یا برٹش گورنمنٹ کا،خطہ اعظم گڈھ اپنی علمی وادبی اور دینی چمک دمک کے ساتھ دنیا کے منظرنامے پر چھایا رہا۔

اعظم گڈھ کی علمی وادبی تاریخ کوآسانی سے سمجھنے کے لیے اسے چارادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، پہلا مشرقی سلطنت کا عہد دوسرا الودیوں کا زمانہ تیسرا دورمغلیہ اور چوتھا نوابین اودھ کا زمانہ۔

اعظم گڈھ کی علمی ترقی کا پہلا دور۷۰۴ھ سے شروع ہوکر۸۸۱ھ پرختم ہوتا ہے اس عہد میں بڑے بڑے علماء اورشیوخ دوردراز علاقوں سے سفر کرکے جون پور ہوتے ہوئے اعظم گڈھ آئے اوراس کے اطراف میں بودوباش اختیار کی۔

اعظم گڈھ میں علم وادب اورتہذیب وتمدن کا دوسرا دور۸۸۱ھ سے شروع ہوکر۹۳۲ھ پرختم ہوتا ہے

اس عہد کے ایک مشہور عالم و بزرگ شیخ قطب الدین ''بینا دل'' سرہر پوری الجونپوری ہیں جن کے فیوض و برکات اور علم وعرفان کی کرنیں جونپور، غازی پور اعظم گڈھ اور فیض آباد کے علاقوں میں پھیلیں۔

اعظم گڈھ کی علم وفن کی ترقی کا تیسرا دور اس دیار میں مغلیہ سلطنت کے قیام سے شروع ہوتا ہے، جو (۹۳۲ھ سے ۱۱۳۰ھ) بابر سے شروع ہو کر فرخ سیر کے عہد پر ختم ہوتا ہے۔ یہ دوسو سالہ دور اپنی علم وادب اور تہذیب وثقافت کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔ اور اسی تیسرے دور میں گذشتہ دونوں دور کی علمی و دینی اور ادبی وتہذیبی سرگرمیوں ،تحریکوں اور ترقیوں کے اثرات وثمرات نکھر کر سامنے آئے ۔اس دیار کے قریات وقصبات علم وعلماء کی برکتوں سے مدرسہ علم ودانش بن گئے۔ بابر کے دور میں برونہ ضلع اعظم گڈھ میں شیخ احمد بن زین جونپوری برونوی متوفی ۹۶۳ھ تھے۔ یہ ایک متبحر عالم ،متوکل ،متقی بزرگ تھے۔ اکثر علماء وفضلاء نے ان سے تحصیل فراغت کی ہے۔ یہ زہد وتقوی میں زندگی بسر کرتے تھی اور شریعت کے پابند تھے۔ رسالہ ''نافع'' ان کی تصنیف ہے۔ تمام عمر کسی کے گھر کھانا نہیں کھایا اور نہ کسی کا نیاز قبول کیا۔

اعظم گڈھ کی علمی وادبی ترقی کا چوتھا دور نوابین اودھ کے قیام ۱۱۳۰ھ سے شروع ہو کر ۱۲۷۳ھ تک رہتا ہے۔ یہ دور کل ایک سو اکتالیس سال (۱۴۱) کا ہے جن میں بہت زیادہ اہل علم وفن پیدا ہوئے ہیں۔

انگریزی دور اقتدار میں بڑے بڑے علماء اور ادباء پیدا ہوئے جنھوں نے اردو زبان وادب کی خدمت گراں مایہ انجام دی، اس میں اکثر کا تعلق اسی دیار علم وفن سے تھا مثلاً مولانا فاروق کے شاگردوں میں مولانا شبلی نعمانی ،مولانا جواد بہاری ،مولانا سید سلیمان ندوی، اکبرالہ آبادی ،مولانا عبدالباری فرنگی محلی ،مولانا جمال الدین افغانی ،جسٹس محمود ،جسٹس سرشاہ محمد سلیمان ،جسٹس سرسید عبدالرؤف ،مولانا عظمت اللہ فرنگی محلی ، محمد شاہ سلیمان پھلواری ،عبدالوہاب بہاری منطقی ،مولانا عثمان فلسفی ،مولانا حسن کانپوری ،اقبال سہیل ،حکیم نابینا اور ڈاکٹر مختار انصاری کے نام ملتے ہیں ان میں سے سب کے سب اپنی علمیت وشخصیت کے اعتبار سے اپنے اپنے دور میں ایک ادارہ کی حیثیت رکھتے تھے۔

اعظم گڈھ کے وجود میں آنے تک اردو شاعری ارتقاء کے اعلی مدارج طے کر چکی تھی اور اس وقت کے ہزاروں اشعار ایسے ملتے ہیں جو سلاست وصفائی اور صحت بیان کی حیثیت سے آج کے اشعار کے ہم پلہ نظر

آتے ہیں یہ وہ زمانہ تھا جب ولی دکنی کا دیوان دلی پہنچ چکا تھا اور شمال کے لوگوں کے سامنے ولی کی شکل میں ایک ایسا شاعر آچکا تھا جس کے کلام نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ اردو بلند سے بلند فکر کو اظہار کا خوبصورت جامہ عطا کر نے کی طاقت رکھتی ہے۔لیکن ابھی تک خطہ اعظم گڈھ پر فارسی و عربی میں فکر وفن کے جادو جگائے جاتے تھے یا برج اور اودھی میں شاعری کی جاتی تھی اس وقت بھی اعظم گڈھ کے شعراء میں عمدہ ذوق تھا خود راجہ اعظم خاں ثانی اودھی بلند شاعر تھے ''سنگار درپن'' اس کا بہترین نمونہ ہے۔

اس زمانے کے زیادہ تر مسلم علماء ادب کا شعری سرمایہ عربی و فارسی میں ہے۔اس وقت کے علمائے کرام کے بارے میں یہ بات کسی مبالغے کے بغیر کہی جاسکتی ہے کہ سرزمین اعظم گڈھ علامہ شبلی سے قبل ہی ایسے پائے کے اہل کمال پیدا کر دیئے تھے کہ ان کی عربی و فارسی رشک عرب و فارس ہے مثال کے طور پر علامہ شبلی کے استاد مولانا فاروق چریا کوٹی اور دیگر چند اہم شعراء کے نام پیش کئے جاتے ہیں۔مولانا اسلم جیراج پوری ،علامہ شبلی نعمانی ،قاضی اطہر مبارک پوری ،علامہ اقبال سہیل،مولانا کیفی چریا کوٹی ،مرزا احسان بیگ ،اکمل اعظمی ،یحیی اعظمی ،امجد علی غزنوی ،معین احسن جذبی ،رحمت الٰہی برق اعظمی وغیرہ ،اس زمانے کے تقریبا تمام استاد فن کی حیثیت رکھتے تھے۔بعد کے شعراء نے انھیں شعراء کرام سے استفادہ کیا ہے اور ان کی شاعری پر کم و بیش انھیں اساتذۂ فن کا رنگ غالب ہے۔

انور اعظمی کے دور میں جن شعراء نے اردو شاعری کی ان میں کیفی اعظمی ،خلیل الرحمٰن ،حسین اعظمی ،انجم اعظمی ،افتخار اعظمی ،اختر اعظمی ،علی جواد زیدی ،ناطق اعظمی ،شاہد ماہلی ،مختصر اعظمی ،رشید انصاری ،ساغر اعظمی ،ماہر انصاری اعظمی ،نشاط سیمابی اعظمی ،غنی اعظمی ،فراز مبارکپوری ،رام کمار فہیم ،ماہر محمد آبادی ،برق اعظمی ،ڈاکٹر اشفاق اعظمی ،سیفی اعظمی ،اعظم کرہانی ،محشر صادق ،ایاز اعظمی ،کامل محمد آبادی ،محسن اعظم گڈھی ،یاور اعظمی ،فخر الاسلام اعظمی ،عرفان اعظمی کا نام قابل ذکر ہے جنھوں نے انور اعظمی کے دور میں اردو شاعری میں اپنا نام روشن کیا۔

انور اعظمی ضلع اعظم گڈھ کے ایک گاؤں موضع مہوارہ کے ایک معزز گھرانے میں ۱۹ جولائی ۱۹۲۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔آپ کی ابتدائی تعلیم قرآن مجید ،دینیات ،خوش نویسی اور اردو ایک لائق استاد مولوی عبد الوحید صاحب کی نگرانی میں گھر پر ہی دلائی گئی۔دس سال کی عمر میں ان کا داخلہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں

ہو گیا جہاں سے انہوں نے ۱۹۴۷ئمیں عربی زبان وعلوم دینیہ کی سند فراغت حاصل کی۔اس کے بعد وہیں پر تدریس کے فرائض بھی انجام دینے لگے تھےلیکن جلد ہی اسے ترک کر دیا تھا،آپ کچھ دنوں تک ماہنامہ''زندگی ''رام پور سے بھی منسلک رہے پھر اپنے چچا شیخ عبدالحمید صاحب کی دعوت پر۱۹۵۲ء میں برما کا سفر کیا اور وہیں رہ کر انھوں نے دیگر کاموں کے علاوہ ہفت روزہ''البلاغ ''،''انقلاب''اور''پرواز'' کی ادارت کی کمان بھی سنبھالی اور ایک دیانت داراور جرات مندانہ صحافت کی مثال قائم کی ،وہ روزنامہ''پیغام'' کانپور سے بھی کچھ دنوں تک منسلک رہے،لیکن بیمار ہو جانے کی وجہ سے جلد ہی گھر واپس آگئے اور اسی بیماری میں ٦ مارچ ۱۹۶۱ءمیں ان کا انتقال ہو گیا۔

انور اعظمی فطرتاً زود نویس تھے انھوں نے کئی میدانوں میں طبع آزمائی کی ہے مقالات ،طنز ومزاح ،خطابت ،نظمیں ،غزلیں ،افسانے ،ڈرامے سبھی کچھ لکھ لینے پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔انھوں نے اپنا ادبی سفر لگ بھگ پندرہ سال کی عمر میں شروع کیا تھا۔انور نے اپنی زندگی کے اس مختصر سے سفر میں اپنے ادب کے لئے تخلیق کے مواقع فراہم کرنے کے لئے زندگی کے صفحات کومختلف زاوئے سے دیکھا ہےاور بے شمار تجربات کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ہر صنف ادب سے متعلق وافر ذخیرہ معلومات ونگاہ رکھنے کے ساتھ ساتھ خود بھی اعلی درجے کے ادیب اوراور ہر صنف ادب پر دسترس رکھنے والے تھے۔

مقالہ نگار کی حیثیت سے انور اعظمی کے یہاں زیادہ تنوع ہے انہوں نے مذہبی موضوعات کے علاوہ تاریخی مضامین میں مسلمانوں کے علمی کارناموں کا جائزہ لیا ہے۔انھوں نے اپنے تعلیمی مقالات میں خاص طور پر مسلمانوں کے نظام تعلیم کا جائزہ لیا ہے۔ان کے علاوہ انھوں نے خالص ادبی موضوعات سے متعلق بھی مضامین لکھے ہیں جن لوگوں نے ان کے دور طالب علمی اور بعد کے قلمی جرائد''تسنیم''،ماہنامہ''کارواں'' کے مقالات دیکھے ہیں انھیں اس کا بخوبی اندازہ ہے۔

رسالہ''زندگی''میں انھوں نے عمرانیات سے متعلق ایک سلسلہ مضامین نظم اجتماعیت کی بحث پر مشتمل ''فرداوراجتماعیت'' کے عنوان سے لکھا تھا۔یہ سلسلہ اگر چہ بدقسمتی سے ان کے فکری خاکہ کے مطابق مکمل نہ ہو سکا پھر بھی انہوں نے اس کا جتنا حصہ لکھ دیا وہ ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔

انور اعظمی ایک افسانہ نگار بھی تھے پہلے تو ابن مختار اور بعد میں انور اعظمی کے نام سے افسانہ لکھنے لگے۔

ان کا انداز اپنے پیشرو پریم چند کا سا ہوتا تھا۔لیکن اس میں بھی ان کی ایک خاص انفرادیت ہوتی تھی جو بڑی دلکش اور دل آویز ہوتی تھی وہ جو کچھ لکھتے ایسا معلوم ہوتا کہ کافی مطالعہ کے بعد لکھ رہے ہیں،مقصدیت پلاٹ کے ساتھ اچھا میل کھاتی ہے۔اس کے علاوہ انور اعظمی نے بچوں سے متعلق ادبی کہانیاں،ڈرامے اور تمثیلی کہانیاں بھی لکھی ہیں جو کتابی شکل میں منظر عام پر آ چکی ہیں۔

انور اعظمی میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ اپنے آس پاس کے ماحول سے کبھی نہیں ہٹے زیادہ تر وہ اسی گاؤں کے سماج کو ہمارے سامنے رکھتے ہیں جس میں وہ خود رہتے بستے ہیں۔لیکن اس کے باوجود ان کی تصویر کشی میں وہ بدمزگی نہیں جو عموماً دیہاتی سماج کا نقشہ کھینچتے وقت اشتراکی ادیبوں کے قلم سے ظاہر ہوتی ہے۔

انور اعظمی کے افسانوں کی تعداد لگ بھگ چوبیس ہے جو کہ ان کے زمانے میں مختلف رسالے اور میگزین میں شائع ہو چکے ہیں۔ان افسانوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ وقت کے رواں دواں ادب کے خلاف ایک طاقت ور بغاوت تھے۔نئے انقلابی مقاصد کے اعتبار سے ان میں طرز نگارش کی جدت پوری طرح نمایاں ہے،ان کی تشبیہوں اور استعاروں میں تازگی ہے تکنیک میں ارتقائی رجحان اور نئے مواد کے لئے سانچوں کی طلب کا جذبہ کافی نمایاں ہے،گویا نیا مقصدی ادب اپنی تکمیل کے لئے ایک سازگار فضا خود ہی تیار کر رہا ہے افسانہ نگار عام راستوں سے ہٹ کر ایک نیا راستہ اختیار کرتا دکھائی دے رہا ہے۔

انور اعظمی کا جوہر جس میدان میں سب سے زیادہ چمکا وہ ان کی شاعری کا میدان ہے،شاعری میں غزلیں،قطعات اور نظمیں بھی کہیں جو خاصے کی چیزیں ہیں۔نظمیں بالخصوص اہمیت کی حامل ہیں،آپ کی نظموں کا مجموعہ ''اذان سحر'' کے نام آپ کے انتقال کے بعد اگست ۱۹۶۷ء میں شائع ہو سکا جسے لوگوں نے بے حد پسند کیا۔جب کہ ان کا دوسرا غزلوں کا مجموعہ نالہ شب کا نام سے ۲۰۱۶ء میں چھپ کر منظر عام پر آ چکا ہے۔ آپ ایک پختہ کار شاعر تھے۔آپ کے یہاں ایک بہت ہی خاص بات یہ نظر آتی ہے کہ آپ کی ساری تخلیقات پر اسلامی فکر اور اسلامی رنگ غالب ہے دراصل آپ ایک دردمند دل کے مالک تھے ان کے دل میں ملت اسلامیہ کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا تھا بقول کوثر اعظمی:

''اسلام کی زبوں حالی اور ملت اسلامیہ کی کسمپرسی اور زبوں حالی پر ان کا دل خون کا آنسوں روتا تھا وہ اسلام کو غالب اور ملت اسلام کی شیرازہ بندی کے خواہش مند تھے''۔

اوراس کے لئے وہ ہمیشہ فکر مند رہا کرتے تھے اورانہیں وہ اپنی شاعری کے موضوعات میں شامل بھی کرتے تھے ،ان کے یہاں اصلاحی اورتعمیری پہلو کے ساتھ ساتھ اسلامی رنگ بھی بہت زیادہ نمایاں ہے

انور اعظمی کی غزلیں ان کی کہی ہوئی دوسری اصناف سخن کے مقابلے میں زیادہ ہیں ۔ان کی بحریں نہ تو بڑی ہیں اور نہ ہی چھوٹی ہیں بلکہ وہ بیچ کی بحروں کا انتخاب کرتے ہیں ،ان کی غزلوں میں موجود غم صرف محبوب کا غم نہیں ہے،ان کا غم غم انسانیت ہے وہ خود میں ڈوبے رہنے کے قائل نہیں ہیں بلکہ وہ دوسروں کا غم بھی کھاتے ہیں انہیں صرف محبوب کی ملاقات مطلوب نہیں بلکہ وہ اسکی جدائی میں ہونے والے دوسرے غموں کی تلافی بھی چاہتے ہیں ۔

انور اعظمی اپنے محبوب کو گلی کوچوں میں نہیں ڈھونڈتے حتی کہ وہ ان سے ملنے کی خواہش بھی نہیں کرتے ان کے لئے بس اتنا ہی کافی ہے کہ وہ ان کی یاد میں محو رہیں اور اسی بات کو وہ حاصل زندگی سمجھتے ہیں ،محبوب کی دی ہوئی ہر چیز انور اعظمی کو بے حد عزیز ہے اس سے منسوب ہر چیز کو وہ صرف یہی نہیں کہ حرز جاں بناتے ہیں بلکہ اس کی بدنامی کی ڈر سے اس کا نہ نام لیتے ہیں اور نہ اس کا بدل چاہتے ہیں

انور اعظمی کی شاعری غم عشق کی شاعری ہی نہیں بلکہ اس میں کائنات کا غم بھی پوشیدہ ہے جو لہجہ بدل بدل کر سامنے آتا ہے ۔

رباعی کی بحر عام طور سے مشکل سمجھی جاتی ہے اس لئے کثیر تعداد میں رباعیاں نہیں کہی گئی ہیں ،لیکن اس کے باوجود یہ صنف ہر عہد میں مقبول اور محترم رہی ہے چنانچہ ہر بڑے شاعر نے رباعیاں ضرور کہی ہیں انور اعظمی نے جہاں اخلاقی ،فلسفیانہ ،رباعیاں کہی ہیں وہیں اصلاحی اور سیاسی رباعیاں کہ کر قوم کو سدھارنے کی کوشش کی ہے ۔انور کو مغرب زدگی اور مغربی تہذیب کی کورانہ تقلید سے نفرت تھی وہ اس سیلاب کو روکنے کی پوری کوشش کررہے تھے انہوں نے ایسی سیاسی رباعیاں بھی کہیں جن میں مغربی تہذیب کا مضحکہ اڑایا گیا ہے ۔

رباعی کی طرح قطعہ کو بھی اردو شاعری میں خاص مقام حاصل ہے یوں تو قدیم شعراء کے کلام میں بھی دو یا دو سے زائد ایسے اشعار کو قطعہ کہا جاتا ہے جس میں کوئی مضمون یا خیال تسلسل کے ساتھ پیش کیا گیا ہو لیکن جدید شاعری میں دو اشعار یا چند مصرعوں کے قطعہ کو ایک آزاد اور علحدہ صنف سمجھا جانے لگا اور آہستہ آہستہ یہ صنف مقبول بھی ہونے لگی ۔انور اعظمی نے بہت سے ایسے اشعار کہے ہیں جنہیں قطعہ بند کہا جا سکتا ہے مثال

کے طور پر ان کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

چھپا چھپا کے نہ رکھ ان جگر کے داغوں کو
انہیں ستاروں سے ایک آفتاب پیدا کر
نہ ہو سکے تو شکایت نہ کر زمانے کی
جو ہو سکے تو کوئی انقلاب پیدا کر

انور اعظمی نے اپنی نظموں کو چند بندھے ٹکے موضوعات کے دائرہ سے نکال کر ہر طرح کے خیالات اور تجربات کے اظہار کا ذریعہ بنایا لیکن جہاں تک ہیئت اور نظم کی ظاہری ساخت کا تعلق ہے انہوں نے کوئی نئے تجربے نہیں کئے بلکہ مروجہ اور مسلمہ ہیئتوں یعنی مثنوی، مسدس اور رباعی وغیرہ کو ہی اظہار خیال کا موضوع بنایا۔ انہوں نے اپنی اصلاحی اور اختراعی قوتوں کو صرف موضوعات کی جدت، اظہار صداقت اور ندرت خیال تک ہی محدود رکھا۔ ''طلب''، ''نذر''، ''قید تنہائی''، ''مسلم''، ''انتظار''، ''عید کا چاند''، ''خودشناسی''، ''لال قلعہ''، ''تاج محل'' وغیرہ جیسی بہت سی نظمیں ان کے مجموعہ کلام ''اذان سحر'' میں موجود ہیں۔

انور اعظمی نے بہت سی نظمیں مسدس کی صنف میں کہیں ہیں مثلاً ''حدیث فردا''، ''حرم تلاش میں ہے''، سلام اے خطہ رنگ''، ''اے ہمالہ''، ''افسانہ غماز'' اور ''آخری مرحلہ'' وغیرہ جیسی نظمیں ہیں، اپنی مسدس میں انہوں نے کہیں قافیہ اور کہیں ردیف دونوں کا اہتمام کیا ہے۔

درج بالا نظموں میں انور اعظمی کا اسلامی فکر نمایاں تریں جز ہے ان کی شاعری کو ادب برائے ادب کے درجے میں رکھنا ان کے فن کے ساتھ ظلم ہوگا۔

انور اعظمی نے اپنی شاعری میں مختلف موضوعات پیش کیا ہے چاہے وہ مغربی تہذب کا ہو جس کا ذکر انہوں نے اپنی نظم ''فتنہ افرنگ'' میں کیا ہے کہ یہ جو مغربی تہذیب اس کا اصل مقابلہ اسلام ہی کر سکتا ہے اور وہ اس روایتی اسلام کے بالکل خلاف ہیں جو مسجدوں تک محدود ہو کر رہ جائے اس کے قائل نہیں ہیں بلکہ وہ اس اسلام کے قائل ہیں جو ہمہ گیر ہو، عدل و مساوات پر مبنی ہو، انصاف دلا سکتا ہو، طاغوت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتا ہو، اسی طرح ان کی دوسری نظم ''یاران حرم'' ہے جس میں انہوں نے مسلمانوں کو بالعموم اور اہل عرب کو بالخصوص جھنجھوڑنے کی کوشش کی ہے ان کے یہاں حسن و عشق کی معاملہ بندی کم ملتی ہے۔

اس میں بھی اجتماعی مقصد پسندی اور قوت تازگی کا اظہار ملتا ہے۔''وحدت آدم'' نامی نظم میں انہوں نے وطنیت کے جذبے پر طنز کیا ہے ان کے نزدیک وطنیت دراصل مرکز توحید ہے، اعوجاج ملت کے لئے عار، انسان کی رسوائی، اور قرآن سے دوری ہے وہ ملت اسلام کے جیالوں کو اس موذی مرض سے جلد سے جلد نجات پانے کی تلقین کرتے ہیں۔''شہزادہ اسلام کی خدمت میں''، ''تحفہ افرنگ''، ''قید تنہائی''، ''شرک''، ''چند لمحے عید کے ساتھ''، ''اے ہمالہ''، ''پندرہ اگست''، ''حرم تلاش میں ہے''، ''تاج محل'' اور ''لال قل'' جیسی نظمیں لکھ کر انور اعظمی نے اپنی شاعری میں مختلف طرح کے موضوعات کا احاطہ کیا ہے جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی سوچ بہت بلند ہے اور اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے جس موضوع کو اپنے شعری قالب میں ڈھالا ہے اس کا حق بحسن وخوبی ادا کر دیا ہے۔ مجموعی طور پر انور اعظمی کا فن افادیت اور مقصدیت کے ایک خاص تصور کے زیر سایہ معلوم ہوتا ہے وہ زندگی کے موجودہ رویہ اور اس کی صورت حال پر کسی طرح مطمئن نظر نہیں آتے بلکہ اس کے خلاف ایک آواز بلند کر کے اپنے معاشرہ کو اس سے چھٹکارا دلانا چاہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے فن میں کرب اور معاشرے کی خستہ حالی کی جھلک جا بجا دکھائی دیتی ہے۔ انہوں نے جس ماحول میں اپنی آنکھیں کھولیں وہ آزادی کے بعد کا زمانہ ہے وہی ہندوستان جس کا خواب پچھلے سو سال سے دیکھا جا رہا تھا لاکھوں لوگوں کے خون کی قیمت ادا کرنے کے بعد جب آزادی نصیب ہوئی تو وہ اس طرح آزادی نہیں تھی جس کی لوگ تمنا کر رہے تھے کیوں کہ آزادی کے زیر سایہ پروان چڑھنے والی بدنظمی، ظلم و جبر اور اندھیرے سے آنکھیں موند کر گزر جانا ان کے لئے ممکن نہ تھا اس مقام پر پہونچ کر ان کی شاعرانہ فکر ایک مرکزیت کی حامل نظر آتی ہے جسے ان کا دینی اور قرآنی شعور مستقل ایک غذا اور اساس فراہم کرتا رہتا ہے ۔ انور اعظمی نے اپنے سر معاشرے کی اصلاح کی ذمہ داریاں اٹھالیں چنانچہ ان کی شاعری ایک خاص نظام فکر اور فلسفے کی تاریخ بن کر رہ گئی جس کی جھلک ان کی شاعری میں ہمیں جا بجا نظر آتی ہے اس طرز فکر نے ان کی شاعری کو تھوڑا بہت محدود کر دیا ہے۔

کتابیات

کتابیات

۱-	اختر انصاری، غزل اور درس غزل، یونین پریس، دہلی، ۱۹۵۹ء

۲-	اختر انصاری، غزل اور اس کی تعلیم، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۱ء

۳-	اختر انصاری، غزل کی سرگزشت، مسلم ایجوکیشنل پریس، علی گڑھ ، ۱۹۷۵ء

۴-	اختر مسلمی، موج نسیم، نامی پریس، لکھنو، ۱۹۶۱ء

۵-	اختر مسلمی، موج صبا، نامی پریس، لکھنو، ۱۹۸۱ء

۶-	اسلام عشرت (ڈاکٹر) خلیل الرحمٰن اعظمی ترقی پسندی سے جدیدیت تک، دانش پبلیکیشنز، کنکر باغ پٹنہ، مارچ ۱۹۸۸ء

۷-	اصغر گونڈوی، نشاط روح، اتل آفسیٹ ورکس، دہلی، ۱۹۸۲ء

۸-	اصغر گونڈوی، سرود زندگی، تاج کمپنی لیمیٹڈ، لاہور، ۱۹۳۴ء

۹-	اطہر پرویز، ادب کا مطالعہ، اسرار کریمی پریس، الہ آباد ۱۹۷۱ء

۱۰-	افتخار اعظمی، تابش سہیل، نامی پریس لکھنو، ۱۹۵۸ء

۱۱-	اقبال سہیل، موج کوثر، نامی پریس، لکھنو، ۱۹۶۷ء

۱۲-	انجم اعظمی، ادب اور حقیقت، کراچی اشاعت گھر، کراچی، ۱۹۷۹ء

۱۳-	انور اعظمی، اذان سحر، کوہ نور پریس، لال کنواں، دہلی، ۱۹۶۷ء

۱۴-	انور اعظمی، نالہ شب، مکتبہ الحسنات، دہلی، ۲۰۱۶ء

۱۵-	انور اعظمی، افسانے، مکتبہ الحسنات، دہلی، ۲۰۱۵ء

۱۶-	انور اعظمی، مقالات، مکتبہ الحسنات، دہلی، ۲۰۱۶ء

۱۷-	انور اعظمی، شاہیں، فاران بک ہاوس سرائے میر، اعظم گڈھ، ۲۰۱۵ء

۱۸-	انور اعظمی، لہرو ، فاران بک ہاوس سرائے میر، اعظم گڈھ، ۲۰۱۵ء

۱۹-	انور اعظمی، ایک کی بات، فاران بک ہاوس سرائے میر، اعظم گڈھ، ۲۰۱۵ء

۲۰-	انور اعظمی، مغرب بعد، فاران بک ہاوس سرائے میر، اعظم گڈھ، ۲۰۱۵ء

۲۱-	انور اعظمی، مسلمان لڑکے، فاران بک ہاوس سرائے میر، اعظم گڈھ، ۲۰۱۵ء

۲۲- انور اعظمی، براہیم، فاران بک ہاوس سرائے میر، اعظم گڈھ، ۲۰۱۵ء
۲۳- بشیر بدر، آسمان، ایم، آر پبلیکیشن، نئی دہلی، ۲۰۱۱ء
۲۴- حسین اعظمی، حرف حق، اردو پبلیشرز، لکھنو، ۱۹۷۱ء
۲۵- خلیق انجم، متنی تنقید، الجمعیہ پریس، دہلی، ۱۹۶۷ء
۲۶- خلیل الرحمٰن اعظمی، اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، لیتھو پرنٹنگ پریس، علی گڈھ، ۱۹۷۲ء
۲۸- خلیل الرحمٰن اعظمی، کاغذی پیرہن، آزاد کتاب گھر، دہلی، ۱۹۵۵ء
۲۹- خلیل الرحمٰن اعظمی، نیا عہد نامہ، انڈین بک ہاؤس، علی گڈھ، ۱۹۶۵ء
۳۰- خلیل الرحمٰن اعظمی، زندگی اے زندگی، اترپردیش اردو اکادمی، لکھنو، ۱۹۸۳ء
۳۱- خلیل الرحمٰن اعظمی، مقدمہ کلام آتش (آتش کا تنقیدی مطالعہ) سلسلہ مطبوعات شعبہ اردو، مسلم یونیورسٹی، ۱۹۵۹ء
۳۲- خلیل الرحمٰن اعظمی، فکر وفن، (تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ)، آزاد کتاب گھر، دہلی، ۱۹۵۶ء
۳۳- خلیل الرحمٰن اعظمی، زاویہ نگاہ (تنقیدی مضامین کا دوسرا مجموعہ)، آورش پبلیشرز، بیراگی (گیا)، ۱۹۶۶ء
۳۴- خلیل الرحمٰن اعظمی، اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک (پی، ایچ، ڈی، مقالہ)، انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۹۷۲ء
۳۵- خلیل الرحمٰن اعظمی، نئی نظموں کا سفر، (اردو نظموں کی ترتیب وانتخاب)، ماہنامہ، کتاب نما، نئی دہلی، ۱۹۸۹ء
۳۶- خمار بارہ بنکوی، رقص مے، حسامی بک ڈپو، حیدرآباد، ۱۹۸۱ء
۳۷- خورشید نعمانی، دارالمصنفین اعظم گڈھ کی ادبی خدمات، رحیمی پریس، بمبئی، ۱۹۷۷ء
۳۸- رشید احمد صدیقی، گنج ہائے گراں مایہ، ریاض ہند پریس، علی گڈھ، ۱۹۴۲ء
۳۹- رشید احمد صدیقی، سہیل کی سرگزشت، نفیس اکیڈمی، حیدرآباد دکن، ۱۹۴۷ء
۴۰- رشید انصاری، پیکر، اپکار پریس، لکھنو، ۱۹۷۹ء
۴۱- رشید حسن خان، ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ، کوہ نور پرنٹگ، دہلی، ۱۹۷۸ء
۴۲- سلام سندیلوی، اردو شاعری میں نثر نگاری، ملی پریس، لکھنو، ۱۹۶۸ء
۴۳- سید احتشام حسین، عکس اور آئینے، سرفراز پریس، لکھنو، ۱۹۶۲ء
۴۴- سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، معارف پریس اعظم گڈھ، ۱۹۸۳ء
۴۵- شاذ تمکنت، مخدوم محی الدین، حیات اور کارنامے، مکتبہ شعر وحکمت، حیدرآباد دکن، ۱۹۸۶ء
۴۶- شاہ معین الدین احمد ندوی، حیات سلیمان، معارف پریس، اعظم گڈھ، ۱۹۷۳ء
۴۷- شاہد ماہلی، کیفی اعظمی عکس اور جہتیں، عزیز پرنٹنگ پریس، دہلی، ۱۹۹۲ء

۴۸- شاہد ماہلی، نئی نظم اور نئے دستخط، شیروانی آفسیٹ پریس، دہلی، ۱۹۸۰ء

۴۹- شباب الدین (ڈاکٹر) کیفی، پرنٹ آرٹ، دہلی، ۲۰۰۶ء

۵۰- شبلی نعمانی، شعرالعجم، معارف پریس، اعظم گڈھ، ۱۹۸۶ء

۵۱- شفیق اعظمی (ڈاکٹر) زاویے نظر، نیشنل کمپیوٹرس خلیل بلڈنگ صدر بازار، مئو، ۲۰۰۱ء

۵۲- شفیق اعظمی (ڈاکٹر) فکرونظر، سراج آرٹ پریس سرائے میر، اعظم گڈھ، ۲۰۱۱ء

۵۳- شفیق اعظمی (ڈاکٹر) ہماری نظمیں، بھرت آفسیٹ، نئی دہلی، ۲۰۰۶ء

۵۴- شمس الرحمٰن فاروقی، اردو غزل کے اہم موڑ، نیوفرینڈس سینٹر، دریا گنج، نئی دہلی، ۲۰۰۶ء

۵۵- شمیم احمد، اصناف سخن اور شعری ہیئتیں، ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڈھ، ۲۰۱۴ء

۵۶- شمیم حنفی، نئی شعری روایت، جمال پرنٹنگ پریس، دہلی، ۱۹۷۸ء

۵۷- عارف رفیع، کلیات سہیل (مولانا اقبال احمد سہیل)، بھاوے پرائیویٹ لیمیٹڈ، بلاس روڈ ممبئی، ۱۹۸۸ء

۵۸- عبادت بریلوی، جدید شاعری، کوہ نور پریس، دہلی، ۱۹۶۸ء

۵۹- عبادت بریلوی، غزل اور مطالعہ غزل، ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڈھ، ۲۰۰۵ء

۶۰- عبدالرحمٰن انصاری عزم شیخ، علی جوادزیدی، حیات شخصیت اور فن، اوم سامی گرافکس، حیدرآباد ۱۹۹۹ء

۶۱- عرفان عباس، آپ، صفدر پریس، لکھنو، ۱۹۷۸ء

۶۲- عروج احمد قادری، اسلامی تصوف، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، نئی دہلی، ۲۰۰۸ء

۶۳- علی جوادزیدی، قصیدہ نگاران اتر پردیش، اسرار کریمی پریس، الہ آباد، ۱۹۷۸ء

۶۴- فضل امام، افکار و نظریات، دانش محل، لکھنو، ۱۹۷۷ء

۶۵- فخرالاسلام اعظمی، اقبال کی نظموں کا تجزیاتی مطالعہ، شبلی نیشنل کالج، اعظم گڈھ، ۲۰۰۶ء

۶۶- فخر عالم اعظمی، امجد غزنوی، خیری پبلیکیشنز، رسالہ بازار، گول کنڈا، حیدرآباد ۲۰۰۲ء

۶۷- قمر رئیس، خلیق انجم، اصناف ادب اردو، ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڈھ، ۲۰۱۱ء

۶۸- قمرالزماں مبارکپوری، سخنوران اعظم گڈھ، جعفر لائبریری، محلّہ حیدرآباد، گیٹ سکھٹی، مبارکپور، ۲۰۱۵ء

۶۹- کامل قریشی، اردو غزل، ثمر آفسیٹ پرنٹرس،، دہلی، ۱۹۸۷ء

۷۰- کلیم الدین احمد، اردو شاعری پر ایک نظر، قومی پریس، پٹنہ، ۱۹۴۹ء

۷۱- کلیم الدین احمد، اردو تنقید پر ایک نظر، سرفراز پریس، لکھنو، ۱۹۶۹ء

۷۲- کلیم الدین احمد، بیالیس نظمیں، دی آزاد پریس، پٹنہ، ۱۹۶۵ء

۷۳- کیفی چریاکوٹی، پارہ ہائے جگر، حکیم برہم پریس، گورکھپور، ۱۹۲۱ء

۷۴- گیان چند جین، تحقیق کا فن، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۸ء

۷۵- مالک رام، تذکرہ معاصرین، مکتبہ جامعہ، دہلی، ۱۹۷۸ء

۷۶- مالک رام، تذکرہ ماہ سال، مکتبہ جامعہ، دہلی، ۱۹۹۱ء

۷۷- مجاور حسین رضوی، جہان افکار، نوشین پبلیشر ز، حیدر آباد، ۱۹۸۸ء

۷۸- دحسین آزاد، آب حیات، کاک آفسیٹ پرنٹرس، دہلی، ۲۰۰۸ء

۷۹- محمد سردار علی، حیات کیفی، شمس الاسلام پریس، حیدر آباد، ۱۳۴۵ھ

۸۰- مختصر اعظمی، القصہ مختصر، سراج آرٹ پریس، سرائے میر اعظم گڑھ، ۱۹۹۵ء

۸۱- مختصر اعظمی، حرف مختصر، فاطمہ آرٹ پریس، لنک روڈ بمبئی، ۲۰۰۰ء

۸۲- مرزا احسان بیگ، مقالات احسان، معارف پریس، اعظم گڈھ، ۱۹۶۸ء

۸۳- مرزا احسان بیگ، پیام زندگی، قادری پریس، اعظم گڈھ، ۱۹۸۶ء

۸۴- مرزا احسان بیگ، پیام کیف، معارف پریس، اعظم گڈھ، ۱۹۴۰ء

۸۵- مرزا احسان احمد وکیل، یاد سہیل، معارف پریس، اعظم گڈھ، ۱۹۵۷ء

۸۶- مشتاق صدف، معین احسن جذبی، ساہتیہ اکادمی، دہلی، ۲۰۰۸ء

۸۷- منور انجم، اقبال سہیل، حیات اور شاعری، مکتبہ جامعہ لیمٹیڈ، دہلی، ۱۹۹۵ء

۸۸- میر حسن الدین، فلسفہ عجم، نفیس اکیڈمی، حیدر آباد، ۱۹۴۶ء

۸۹- ناطق اعظمی، چراغ دل، الہادی پریس، جونپور، ۱۹۵۹ء

۹۰- ناطق اعظمی، غبار راہگزار، کوثر پرنٹنگ پریس، سرائے میر اعظم گڈھ، ۱۹۹۹ء

۹۱- نذیر احمد، غالب نامہ (احتشام حسین نمبر)، عزیز پرنٹنگ پریس، دہلی، ۱۹۹۷ء

۹۲- وحید قریشی، مقدمہ شعر و شاعری، ایجوکیشنل بک ہاوس، اے، ایم، یو، مارکیٹ علی گڈھ، ۱۹۹۳ء

۹۳- وزیر آغا، نظم جدید کی کروٹیں، اسرار کریمی پریس، الہ آباد، ۱۹۶۷ء

۹۴- یحیی اعظمی، نوائے حیات، معارف پریس، اعظم گڈھ، ۱۹۵۰ء

۹۵- یحیی اعظمی، نوائے عصر، معارف پریس، اعظم گڈھ، ۱۹۷۰ء

۹۶- یوسف حسین خان، اردو غزل، معارف پریس، اعظم گڈھ، ۲۰۱۰ء

اخبار و رسائل

اخبار و رسائل

۱- انقلاب رنگون، انور نمبر، ۲۴ اپریل ۱۹۶۱ء

۲- پرواز رنگون، ۲۹، مارچ ۱۹۶۱ء

۳- ایضا، ۳۱، مارچ ۱۹۶۱ء

۴- ایضا، ۴، اپریل ۱۹۶۱ء

۴- ایضا، ۲۳، اپریل ۱۹۶۱ء

۵- ماہ نامہ بزم سہارا، دہلی، ستمبر ۲۰۱۱ء

۶- ماہنامہ شاعر، خلیل الرحمٰن اعظمی نمبر، بمبئی، ۱۹۸۰ء

۷- ماہنامہ نقوش، شخصیات نمبر، حصہ دوم، لاہور، اکتوبر ۱۹۵۶ء

۸- ماہنامہ نگار، جدید شاعری نمبر، کراچی، جون جولائی، ۱۹۶۵ء

۹- میگزین امجد نمبر (انٹر کالج محمد پور) کمر پریس ٹانڈہ، ۸۲، ۱۹۸۳